



ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

# غالب

شخص اور شاعر

بمقامی گورکھپوری

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ



2001

ایڈیشن

پانچ سو

40 روپے

قیمت



ایجوکیشنل بک ہاؤس  
یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

اپنے نواسے

کامران اقبال کے نام

جس کو میں

”سہراب جی“ پکارتا ہوں

بھتیوں

# ترتیب

۷	_____	گفتنی
۹	_____	غالب کا حمد اور غالب
۳۰	_____	غالب : منکر و نکر
۶۷	_____	غالب : اندازِ بیاں
۹۰	_____	غالب اور ہم
۱۲۲	_____	حق تو یہ ہے

ما نبودیم بدیں مرتبہ را صنی غالب  
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد دفن ما

گفتگو

**نخالت** پر تائب ہو کر کبھی ہاں چلا کہ چھر ہی دشت اسکان نقش پا نظر آئے۔ غائب کی خود آگاہی اور فوراً پہنچنے والے مستقبل کا جو اناؤں لگا یا قتلہ اس کے شعر کا طبع صادقاً رہا ہے۔ حال یہ ہے کہ کوئی تعداد اس وقت تک غور و فتویٰ حاصل نہیں کر پاتا جب تک وہ غائب ششما کی کا شہرت نہ دے۔ ارباب عالم احوال غائب کو اردو شاعری کا شایر قرار دیا جاتا رہا ہے۔ میں غلام جتوئی اگر مجنوں گرد کہیں دے، جیسے مثالی تعداد اپنی نکل و ختم کا یہ باب رقم زد کرتے۔ مجنوں صاحب غائب کا سہارا لیے بغیر ہی اپنے آپ کو ایک بڑا ناقد سزا چکے ہیں اور وہ غائب پر بکثرت لکھتے تب بھی ان کا خلقت مسلم رہتی لیکن اردو کے تنقیدی ادب کو غائب شخص اور شاعر تو ہے کہ انھوں نے غائبیات پر ایک نئی ہی کو رو ڈال دی ہے۔

وقت سے اہل نظر کا آقا ماننا تھا کہ مجھے مجنوں صاحب سے یہ کام لینا چاہیے۔ ان کے بعض مقررین نے بھی اس بات پر اتفاق کیا۔ شکر ہے کہ میں اس امتحان سے کامیاب گذرا ہوں اور اس بدخوار کی سے عہدہ نہ آجھڑا ہوں۔

پاکستان میں پروانہ سر جیٹوں کو رکھواری کی یہ پہلی تھنیف ہے جہاں باب قسطنطین د پاکستان کے مسئلہ تعاون اور جیٹوں کی تقریری شکل ہے۔ ان جیٹوں کا اہتمام کر چکیں پریس کلب کے اشتراک سے کیا گیا تھا۔ تاہم پریس کلب کے اہتمام میں پریس کلب کے اہتمام میں جیٹوں کا اہتمام ہے۔

اس کتاب کی تحریر و تکمیل کے دوران مجھے بہترین صاحب کو قریب سے دیکھنے کا خوشگوار اتفاق ہوا۔ اس عمر اور حسن ذاتی صحت کے اس عالم میں بھی وہ جوانوں کا سامنہ صلہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنی

وقتِ ملاوٹی کے ملک ہیں کہ مجھے یقین ہے ان کی نگلیوں میں بھی، رشتہ نہیں آئے گا اور ان کی بکڑ کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوں گے۔

میں نے بعض بڑے کتب خانے دیکھے ہیں۔ بعض کی قمر بنیں ٹخنی ہیں لیکن کوئی بھر سے پوچھے کہ سب سے مخبر کتب خانہ کون سا ہے تو میں بے دریغ کہوں گا، مجنوں گو رکھپوری۔ مجنوں صاحب بے مثال حافظے کے ملک ہیں۔ غلب کے اس مطالعے میں مجنوں نے جیشِ استغادر اپنے حافظے کی سے کیا ہے۔

مجنوں صاحب کی شخصیت کو روبرو گفتگو کرنے کا یہ عمل نہیں اور اس کتاب کے بارے میں کسی ناقدانہ رائے کا اظہار میرا منصب نہیں پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ کتاب اگر غلب جیسے نام آور شاعر کے لئے ہے تو اس کے مصنف بھی مجنوں گو رکھپوری جیسے تخلیق کار ناقد ہیں۔ غالیات کے مغربی بلا سبائز یہ ایک ایسا افسانوی منزل ہے جس سے آئے متدم بڑھانے کے لیے ایک اور مجنوں گو رکھپوری کی ضرورت ہوگی۔

شبہم رح صفائی





## غالب کا عہد اور غالب

شخصیتیں اولیٰ ہوں یا اہل تاریخ کی مخلوق ہوتی ہیں میں زمانہ کے کسی مخصوص دور کے مادی اور فاعلی سہ پہلے ماحول میں اقتصادی ماحول سماجی حیثیت قریب ترین ماحول کے اثرات میں شامل ہوتے ہیں افراد کے کردار و حیل کا نتیجہ بنتی کرتے ہیں اور ان کی شخصیتوں کی تشکیل و تربیت میں خود تک حصہ لیتے ہیں۔ آج زندگی کے اس نظریہ سے شاید یہ کہانی بدستور ہو کہ تاریخ اختلاف کرنے کی ضرورت محسوس کرے۔ اس لیے کہ یہ ایک حقیقت ہے جو مسلم ہر جگہ ہے۔ لیکن حقیقتیں بھی کچھ ایسی نہیں ہوتیں، چنانچہ اس حقیقت کا بھی ایک دوسرا رخ ہے۔ یہ سچ ہے کہ تاریخ شخصیتیں پیدا کرتی ہے لیکن یہ بھی کہ کچھ نہیں کہ بعض شخصیتیں تاریخ آفریں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے عسکری فنون ہوتے ہوئے نئے عسکری آفریں گاہر ہوتی ہیں۔ یہ عظیم اور توانا شخصیتیں زمانہ کا مرکب بنیں بلکہ رنگ بناتی ہیں۔ وہ زمانہ سے صرف محبت حاصل نہیں کرتیں بلکہ زمانہ کو اپنی سمت میں موڑ دیتی ہیں۔ کلاسیکل اور اس کے ہمنواؤں کا خیال بھی بنیادی طور پر سچ ہے کہ تاریخ ایک سلسلہ ہے عظیم شخصیتوں کے عظیم کارناموں کا جس میں ہی عظیم شخصیتیں تابندہ یا باطل یا جوہر یا بل (GENIUS) نکلتی ہیں۔ نابھ کی نظریہ زمانہ پر ہوتی ہے۔ مگر وہ ایسی گورہیں بصیرت بھی اپنے اندر رکھتا ہے جو اس کو اس کا ہی بنانے کے کہ اپنے زمانہ کے نقائص کو کچھ اور اس نئے زمانہ کا تصور کر سکے جو آئے گا۔ چنانچہ اس کے زمانہ کی خرابیوں اور فاسیوں کو دور کر کے فلاح و ترقی کے نئے اسباب لانے والا ہے۔ نابھہ حال سے ناامودہ اور خوش آئند مستقبل کا ناز و مناد اور خطر ہوتا ہے۔ وہ متوجہ نصاب زندگی کا جب ناقص محسوس کرتا ہے تو اس سے انحراف یا بجاہوت ہے اپنے کو الہامی طور پر مجبور پاتا ہے۔ لیکن وہ محض نباتات کے لیے بنادیت کرنا نہیں سکھاتا۔ اس کی بنیاد و ستا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے نظام زندگی کا تصور پیش کر سکے جو موجودہ اور گذشتہ دونوں سے زیادہ جمیل ہو۔ وہ اپنے دور کے فنون اور مضامین کا اندھا مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ ان سے زیادہ توانا اور فلاح بخش فنون اور مضامین کے تصور میں لگا ہوتا ہے۔ وہ روایات کی عظمت کو تسلیم کرتا ہے اور ان کا احترام کرتا ہے لیکن وہ مجتہد بھی ہوتا ہے اور جب ان روایات میں



دو فریادیں ہوتا تو وہ اس میں سے زندہ نہ نکلا ہوتا کہ اگر کے اور زندہ دلیات کے ساتھ ان کو شیر و شکر کے زندگی کی نئی بنیت کی تشکیل کرتا ہے۔ اقبال کے دو مصرعے اس پر گزریہ شخصیت کی بہترین صیغہ نفاذ کی گئے ہیں۔

دلہ بہ دو شش و نگاہ ہم بہ عبرت امروز  
شہید جلوہ مند و دکانہ آئینہ

ایسے قہرانی مسو کا ہر دور ہی پیدا ہوتے ہے جس کا ہے وہ احساس و فکر کے میدان میں ہوں چاہے عمل و پیکار کے میدان میں۔ کبھی کبھی ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو بیک وقت دونوں میدانوں کے مرو جوتے ہیں۔ یونان قدیم میں ایسی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ احساس و فکر کا شور مچا کر اپنے زمانہ سے آگے ہوتا ہے اس لیے اس کے کردار و گفتار میں کچھ ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جو اس کے زمانہ کے اقتدار سے خارج المرکز ہوتی ہیں اور لوگ اس کو اجنبی پاتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود اپنے کو کسی سے اجنبی نہیں پاتا ہے۔ وہ تو سب کا دوست ہوتا ہے اور سب کے لیے خیر و برکت کا آرزو مند ہوتا ہے۔

ابن ابی کبک ایسے ہی مثال اور واضح نظر شخص تھے جن کو ہندو باطل ماننا پڑتا ہے۔ فکر و بصیرت میں وہ چہ عجب بہت آگے تھے اور مستقبل میں بہت دور تک دیکھ سکتے تھے۔ ان کو عزت گراؤ کی ایسی عطا ہوئی تھی کہ وہ جو کچھ دیکھتے اور سوچتے اور سمجھتے تھے اس کے لیے دریاغ اظہار میں ان کو کوئی پس و پیش یا تہذیب نہیں ہوتی تھا۔ اس کی عظمت کے وہ معجز تھے اور اس کی یاد ان کے دل میں ایک سنگِ پیدائشی رہتی تھی لیکن ان کی عبرت نگاہ کوئی کبھی بھول کیسیت نہیں تھی بلکہ ایک خلاق قوت تھی جو احمی اور حال کے زندہ اور صالح عناصر کو لے کر اور ان کا رشتہ اتوار کو جہاں کہیں چھوڑ کر ایک نئے اور زیادہ مبارک مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتی تھی۔ غالب روز قبولِ تسلیم و جہتا کا سلیقہ رکھتے تھے۔ گزشتہ اور موجودہ قدروں میں جو قدریں جاننا اور قرآن میں اور مستقبل کی نئی قدروں کے ساتھ عمل میں رکھنی تھیں۔ ان کو وہ قبول کیے ہوئے تھے اور فرشتہ اور بے ہاں قدروں کو بے دردی کے ساتھ رو کر دیتے تھے۔ زندگی کے ساتھ ان کا یہ رویہ اس کی ایک شعر سے واضح ہو جاتا ہے۔

ہرچہ نہ فرمودہ مند و اعظم ہرچہ نہ فرمودہ فرار آدم

یہ ایک ترجیح ہند کا شعر ہے جو بارہ شاہ ظفر کی شان میں ہے

غالب اسلام کے عظیم کارناموں کی کتنی قدر کرتے تھے انہی سے خود اپنے ذوق کی تربیت اور تہذیب کی طرح کرتے تھے۔ اس کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے جن میں انہوں نے کبار و شعرا بالخصوص خاص شعرا کی بانگاہ میں ہر امداد پیش کیا ہے۔ پیشرو اور دشمنوں میں وہ حیرت کی عظمت کے دل سے مسرت رہے اور اپنے مزاج کے مطابق



انہوں نے تیرے اثر قبول کیا۔ ہم صحرش حرد میں وہ عرصہ کی لذت نکر اور وقت غفلت اور شہیت کے تربیت یافتہ لائق شری اور  
حیات عقید کے قائل تھے لیکن غاصر شامی میں جتنے بزرگان ملی ہوئے ہیں۔ ان سب کے تمام دوسرے کو غالب نے صرف  
پہچانا اور تسلیم کیا ہے۔ بلکہ ان کی زمیں میں اکثر غزلیں اور قصیدے لکھے ہیں اور انہیں کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر ساتھ  
ہی ساتھ ان کی ہرئی کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس مجال کی تفصیل دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں جب غالب کی شاعری سے  
بحث ہوگی لیکن آج کی صحبت میں بھی کچھ مثالیں پیش کرنا ضروری ہیں جس سے اندازہ ہو سکے کہ غالب کے ظہری غزل اور غزل  
شعور کی تربیت میں ان مختوران ماسلف کے کمالات کے اثرات کس حد تک شمل ہوئے۔ غالب نے اردو شاعری کی غہن  
میں کسی کو اپنا ہم سر نہیں پایا۔ اسی لیے وہ فارسی اساتذہ کی غفلت میں پتھے۔ یہاں ان کو بہت کھڑکھڑاہٹیں مل گئیں۔ انہوں نے اپنے  
قدوق نگاروں میں اس طرح سو لیا کر پھر دہ کی اپنی فطرت کا جزو بن گیا۔ وہ خود کہتے ہیں :-

لوق فکر غالب را برد از انجمن بیرون

باظہری وصائب مجہم زبانیا مست

اس غزلی کے مقابلہ میں وہ ایک بگڑا اپنے لفظ غافل تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے ان اساتذہ کی زمینوں میں  
غزلیں اور قصیدے لکھے ہیں مگر ان کے سامنے ادب کے ساتھ اپنی اس عبادت کی عظمت بھی کی ہے۔ سعدی کی غزل پر  
غزل کہتے ہوئے سعدی کی ہرئی کا اعتراف تو کرتے ہیں :-

خلق غالب نگر و دستہ سعدی کو سرود

خوب رویان جفا پیشہ وفا نیز کنند

کبھی ان کے دل میں دلوں پیدا ہوتا ہے کہ وہ چند غزلیں غفانی کی لے اور نکلیا کی دھن میں ستائیں

پر وہ چند بہ آہنگ نکلیا برائے

غزلے چند بہ بہتیار غفانی بشنو

کبھی وہ کہتے ہیں کہ جب تک غزلی اور غزلی کے طرز سخن کو اچھی طرح نہ پہچان لیا جائے ان کے مذاق کو نہیں

سمجھا جاسکتا۔

غالب مذاق ماتواں یا فتنی زما ۔ روشیدہ نظری و طرز حری شناس

اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غفانی کی سببہ کو متعلق غزلی کی پرتال غزلیت اور شیخ علی حری کی انکس گریز

دہانک کے آثار حریز نہیں کی طرح دوسرے اساتذہ کے کلام کے ارتعاشات اور غزلی کی تخلیق اچ کے ساتھ اس طرح لکھے



نے محسوس ہوتے ہیں کہ ان کا پھر توجہ نہیں کیا جاسکتا۔ صاحب کی ایک غزل پر غزل کہتے ہوئے کہتے ہیں :-

اے جواب آں غزل غالب کہ صاحب گنہ گشت

در غم و نقشہا ہے اخت یار افتادہ ام

اور غزل کی تربیت پر اپنا قصہ اس طرح پیش کرتے ہیں :-

غالب از جوش دم مارتیش گلبرخش باد پر وہ ساز غموری را گل افشای کردہ ایم

ایک دوسرے شعر میں بہت صاف کہتے ہیں :-

بہ نظم و شعر مولانا عہتوں کی زندہ ام غالب رنگ جاں کردہ ام شیرازہ اور آقائے کناش را

غالب نے جس فارسی شاعر کو سب سے زیادہ پسند فرمایا وہ بیہول تھا جو اہل ایران سے نہیں تھا ہندی تھا تھا۔ مزاج و کردار اور فکر و گفتار کے اعتبار سے غالب بیہول کی طرف ایک ناگزیر پیش محسوس کرتے رہے ان کے ہندوئی اور دھرم میں کوئی تبدیلی نہ تھی۔ ہندوئی کی حد تک غلامی سے تعلق اور دھرم کی تعلیم کا وہ غلام ہی تھا۔ تواریخ اور خوش آہنگی کے ساتھ بیہول کے آہنگ سے متاثر ہے جو ان کے چنگل اور دھرم کے فوٹو کی تخلیق ہے جب کہ ان کا اپنا انداز اور رنگ قائم ہو چکا تھا۔ وہ یہی کہہ کر نہیں رہ جاتے کہ :-

مجھے دنگ بہار ایجاد ہی بیہول پسند آیا

بلکہ بڑے سلیقے کے ساتھ استوار کرتے ہیں کہ

آہنگ اسد میں نہیں بڑا نفوذ بیہول عالم ہر افسانہ دار و دماغ

یہ بعض پسند اور انتقاد کا معاملہ نہیں تھا۔ یہ ہم کو ادبی اور ہم تقدیری کا احساس تھا جو غالب کو بے اختیار بیہول کی طرف کھینچ رہا تھا۔ بیہول کی روایت سے غلام کا ادب کہتے ہوئے ایک انفرادی شاعر تھا۔ غالب کی اسلاف کی تہذیبی میراث کی قدر کرتے ہوئے ایک انفرادی شاعر تھے۔

اس بارڈر کو بھی گننا چاہئے کہ ان فارسی شاعروں کے سامنے وہ مزاج حقیقت پیش کرتے ہیں جنہیں کوہ استخوان بیہول بھی کہیں چاہئے مثلاً بیہول نے شوخ و خفاں کی طرف رجحان دیتے ہوئے کہتے ہیں :

سجے شوکت غزل کی بود شیرازی مشو امیر ز آبی کہ بود خواندہ

وہ یہ کہتا ہے جس کی غزلوں پر وہ غزلیں اور قصیدوں پر قصیدے لکھ چکے ہیں اور جس کی تقلید کا ان اعتراض

کر چکے ہیں :-



مکتبہ ام غلاب طوط ہا شرب لڑکی کرگفت تو نے دریا سبیل و قمر صیا آتش است  
جس حری کی لڑکی وہ محنت میں اور جس کے رنگ کو وہ خود اپنے رنگ سے عاشق پاتے ہیں اس کے بلے میں  
بجھ رہے تھے ہیں۔

اندویش شیعہ گنڈا کرداری غلاب مرقع زکرم شیخ علی رامان  
بظاہر عجیب ہی بات معلوم ہوتی ہے۔ کیا غلاب نے حری کے ہاتھ میں اپنی لڑکی بلی دی ہے۔ نہیں لیا نہیں  
ہے اور غلاب کی ایک لڑکی دو مری لڑکی کی تردید نہیں کرتی غلاب متقدم میں سے تھیں ایک شعور کی عظمت کے حامل تھیں اور  
ان کے کام سے اپنی طبیعت اور استعداد کے مطابق اثر قبول کرتے تھے لیکن اس اثر کو وہ اپنے کو محدود رکھنا نہیں چاہتے  
تھے۔ وہ اساتذہ کی کچھ ٹی جیٹی میراث پر فخر کرتے تھے بزرگوں کی دینی بڑی برکت اور بڑی تقویٰ بخش ہوتی ہے لیکن اس  
دین کو اگر ہم تشریف زندگی کی تعمیری سطح کے ساتھ کام میں نہیں لگاتے تو یہ ہماری ناقابلیت ہے۔ غلاب اس لڑکی کو کبھی  
ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مستقبل کو ماضی اور حال سے منسلک رکھتے ہوئے دونوں سے خوب تر بنانے کے لیے اجتماع اور ابتلا  
سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

جو اساتذہ کو آنے والی نسل کے لیے اپنے تہذیبی لکھا بات کا ترکہ چھوڑ کر گذر گئے ان کی غلاب توال سے عزت  
کرتے ہیں۔ لیکن ایسے بزرگوں کی تعداد بھی کافی ہوتی ہے جو اپنے فکرو سے چھوڑ کر کس اس دور میں اپنی عمر کی میراث دینی کرتے  
ہیں جو نئی نسل کا دور ہوتا ہے۔ ان بزرگوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو زندگی کا تاریخی شعور رکھتے ہیں جن کو اپنے  
عہد شباب کی خود یادگاریاں اور میٹری میں ترجمہ پائیں حال کے واقعات کی طرح یاد ہوتی ہیں جو میر کے پیر معاش کی طرح پیر مرد  
ہوتے ہیں اور اپنی باقی عمر جو ان کی مست میں گزارتے ہیں۔ یہ لوگ جو افواج کی مستند روی کو نہ صرف عارفانہ تبسم و رب  
کے ساتھ شش انداز میں دیکھتے ہیں بلکہ اپنی درپردہ فکر و نظر سے ان کے حوصلوں اور دلوں کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ان کی صحبت  
جوں کو جو ان ترشائی ہے اور وہ خود ان کے شباب سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ اگر وہ ان کے جسم و جان میں اتنی سکت نہیں  
ہوتی کہ جوانوں کے ساتھ قدم سے قدم ملائے ہوئے چلیں لیکن تو بہترین امیدوں اور دعاؤں کے ساتھ ان کو آگے بڑھنے کی  
چاہت اور تاکید کرتے ہیں اور منظر ہوتے ہیں کہ یہ جوان زندگی میں کچھ نئی برکتیں لائیں گے۔ غلاب خود ایسے ہی ایک بڑھے  
تھے۔ وہ جوان وہ چکے تھے اور جوانی کی تمام آزاد رفتاریاں ان کی نگاہ میں تھیں۔ وہ بڑھے تھے جس نے ۱۳ سال سے کچھ  
زلیہ عمر اگر اس کو تیار کرنا چاہو تو کچھ کیا۔ لیکن ان کے مزاج میں جو تعلقی حق شناسی اور عدالت تھی وہ ابتداء سے شعور سے آخر  
وقت تک قائم رہی جب کہ ان کے نام آؤں مضمین ہو کر جواب دے چکے تھے اور دماغ میں استعمال باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ان



کی عمر پچاس سال کے قریب ہو چکی تھی جب انہوں نے سرشتہ کو آئینہ بکری کی قیص شہ و شاستہ پر تقریر فرماتے ہوئے یہ کہا کہ خیر کیا تھا کہ تیرہ سو روپیہ کوئی مبارک کام نہیں ہے۔ ایسے کامنا میں کوئی سرمایہ نہ رکھتا ہے جس کا آئینہ رہا ہو۔ سرسید جیسے بہت اعلیٰ لوگوں کے لیے ایسے کام جنگ و ماریجی۔ غالب سرشتہ کو ایک ہونہار آدمی سمجھتے تھے جو نئی نسل کو دولت و خواہی کے گڑھے سے نکال کر ایسے نئے راستے پر لگا سکتے تھے جہاں کو آئندہ علاج و معیہ کی طرف سے جاسکتا تھا۔ اس لیے جب انہوں نے سرشتہ کو آئینہ بکری کی قیص و شاستہ میں سرگرم دیکھا جو ایک ایسے نظام معاشرت اور آئینہ سیاست کی تبلیغ کرتی ہے جو نامعلوم ہو کر شروع ہو رہا ہے، تو انہوں نے اس کی کئی اصلاحات میں مخالفت کی۔ اس لیے کہ غالب آئینہ دنیا کے سخت دشمن تھے۔ وہ نہ صرف غالب سے پہلے اسی سرشتہ کی آثار و تصانیف کی تعریف کر چکے تھے۔ آثار و تصانیف کی تمام کتابوں کو از سر نو زندگی دینے اور مقبول بنانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان کی قریب کے ایسے انقلابات کو اس قدر خوب کے ساتھ انکشاف کیا تو جہاں سے حال بہت بگڑا ہے۔ جسوی انفس کی تربیت کر سکتا تھا اور مستقبل کی بہرہ و ترقی کے مندرجہ تیار کرنے میں جہاں سے ہر صدی کا مصلحت فرما کر ہو سکتی تھی اور ہم کو بہت بگڑا ہوا ہے۔ نو نوں اور شاہوں سے مدد ملتی تھی۔

دوسری قسم ان بڑھوں کی ہے جو کس طرح زمانے کے نئے میلانات و مطالبات اور نئی نسل کے نئے مزاج کو سمجھ نہیں سکتے۔ جو زندگی کی پرانی قدروں اور معیروں کو سمجھنے سے نکلے ہوئے ہیں لیکن نئی نسل کے نئے اقدار پر کوئی اس غصہ نہیں کرتے بلکہ اپنی تمام پسند کی چیزیں اپنے لیے ایک حصار بناتے ہوئے ہیں اور اس حصار میں اپنی باقی زندگی کا عاقبت کے ساتھ گزار دینا چاہتے ہیں۔ غالب ان حرمت گزری، بزرگوں کو آگے دھکیں گے تو ان کے لوگ بگڑ کر کم کو یقین کرتے ہیں کہ انہیں بگڑ کر دیکھو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور غامض اپنے ہی اپنے طور پر اپنی زندگی بسر کرے جائے دو۔ یہ کم کو نہیں سمجھتے تو ہم ان کو کیوں سمجھیں گے۔ بڑے معصوم لوگ ہیں اور ان کی معصومیت کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

لیکن ہم عصر بڑھوں کی ایک تیسری قسم بھی ہے جو اتحاد میں بہت زیادہ ہے۔ وہ بڑھے بڑھے سرشتہ جیسے ہیں۔ یہ خوب جانتے ہیں کہ زمانہ زب و احوال ہے ضرور نہ کہتا ہے جہاں ان کے شباب کے اقیام میں تھا اور زندگی منزل بہ منزل گذرتی جاتی کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے اور ان کے دوسرے قدریں فوسوں میں پہنچ گئی ہیں لیکن بڑھوں کا یہ سٹھ عصر طبقہ تاریخ کی اس ناگزیر اور ناقابل تردید حقیقت کو تسلیم کرنے سے ویدہ و دانستہ اور قصداً ہتھام کے ساتھ ٹکرا کر رہا ہے کہ زمانہ بدلنے کے لیے بہرہ ہے اور زندگی کی فطرت ہے کہ وہ ترقی کرتی ہے اور کسی ایک منزل پر قیام نہ کرے۔ یہ لوگ جب قیادت اور اقتدار کو اپنے ہاتھ سے جانے چاہتے دیکھتے ہیں تو حصار نوجوانوں کے نئے میلانات و مسائل اور ان کے نئے گفتاربات کی ذمہ داری غیر کرتے ہیں بلکہ ان کی ترقی کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ یہ لوگ نوجوانوں سے اس لیے جڑتے ہیں کہ ان کی



استعداد اور اعتماد اختیار کرنا اپنے طبقے سے نکل کر نئی نسل کے قبضہ میں جاتے دیکھتے ہیں اور اپنے کو چاہیں پاتے ہیں۔ یہ  
مردہ بڑا خطرہ کی جگہ ہے۔ نوجوان نسل کو چاہئے کہ تہذیب اور آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے بڑھوسوں کی اس جہت سے  
پریشیا رہے اور خشنڈے دل کے ساتھ ان کی کچھ چیزوں نے والی باتوں کا جواب دیتے رہیں اور ان کی ان تمام کوششوں کی کاشاکرت  
رہیں جو نوجوانوں کے واسطے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لیے کرتے رہتے ہیں۔ خود غائب کا رویہ ان بزرگانی جو بس کے  
ساتھ کچھ اس انداز کا تھا۔

غائب قدما وادان کے کارناموں کی عظمت و حرمت کے معترف تھے۔ اگر یہ سنا نہ ہوتا تو وہ پیدائ صاحبِ عراقی  
نظیری کا دور کی وغیرہ اور اردو میں میر کی شاعری کا مترنہ پہچان سکتے لیکن وہ قدیمت کو کسی صورت میں گوارا نہیں  
کر سکتے تھے۔ وہ متقدمین کے اقتسابات کو صغیر و کبیرا کہتے تھے۔ لوزنی نسل کے وہیں کی تربیت میں ان سے کام لیا۔ جو  
ضروی سمجھتے تھے لیکن ان اقتسابات پر رینک پارنگی کا پچھلے دور کے دنیا میں ان کے خیال میں ضروری تھا۔ ان کا یہ شعر  
کہنے کے لیے بڑی خاطر نظر اور باخ فکر درکار ہے۔

دو نم کو کنگلی زخم شایہ برافکنم در بزم رنگ و بو نخلے و دیگر انگنم

شاعر اس بزم رنگ و بو کی قدر کو تسلیم کرتا ہے جو قدما آراء کر گئے ہیں لیکن اس بزم میں قدیمت اور کنگلی کے  
جوا نگر و طعانات ہیں ان کو دور کر کے نئی زندگی کے نئے میلانات و مطالبات کے مطابق نئی شان اور نیا انداز پیدا کرنا چاہنا  
ہے تاکہ مسلمان کی محنت کا حاصل اخلاف کے لیے بھی قوت و ہمت کا ذریعہ بن سکے۔

غائب کے کردار کی ایک خصوصیت بہت اہم ہے جس کو ہم استقامت کہہ سکتے ہیں اور جو ہر حال میں قائم رہتی  
ہے۔ غائب نہ کبھی انش میں بیکہ نہ مضمر یا کسی اور جذبہ میں۔ وہ جڑے غرور کے آدمی تھے اور کسی حالت میں بھی خود کو اپنے  
ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ان کے کردار میں کسی نزاع یا سے کسی قسم کی تاثر آئیدگی نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کی ہر بات اور  
ہر اور اقربہ اور شائستگی بے ہوشے ہوتی تھی۔ وہ بیک کی طرح آداب کو زندگی کی آبرو سمجھتے تھے۔ اس کا ادنیٰ اثر نہ  
ہے کہ انہوں نے اپنی زبان اور قلم کو کچھ سے کبھی آکودہ ہونے نہیں دیا۔ شعر و شاعری ان کی زندگی اور ان کے  
کلام میں بے شمار عین کی لیکن ان کی شاعری میں اور بنیاد ہوتی تھی اور ان کا طرز ہر موقع پر عارفانہ نمکنت کا حاصل ہوتا تھا۔  
بزرگوں کی ایک جہت کا ذکر کیا جا چکا ہے جو نرم خیزان اور صلح پسند ہے اور جو ہر دور اس کے اس کو ہم نوا بیوں  
متقدمین میں یہ نظر آتی ہیں اور جو نئی نسل کے نئے رجحانات اور اسالیب سے کسی طرح باخوش نہیں ہو پاتی۔ نوجوانوں سے  
انجمن نہیں غائب ایسے کو خطرناک سمجھتے ہیں اور ایک محدود دائرے میں ان کے غرض کی قدر کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی



دہم بے بی خانم خانہ شرفی کے ساتھ قلعہ کوچکانہ کی کاشتش بھی کرتے ہیں۔ اس کو ایک مثال سے کیجئے جس کا تذکرہ حافظانہ  
 یادگار غالب میں کیا ہے۔ ایک روز نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے گھر پر کچھ بے تکلف احباب اکٹھے تھے۔ غالب بھی تھے۔ ستر  
 صدر الدین آذر وہ بھی تھے اور عالی بھی تھے۔ سب کے سب تربیت یافتہ ترقی رکھنے والے تھے۔ کھانے میں بھی دینی شعور  
 سخی کاج چاچر گیا۔ اتنے میں غالب کی نظر خود اپنے نازی دیوان کے کچھ اور اوراق پر پڑ گئی۔ وہ آذر وہ کے مزاج اور سیلان میں  
 سے ابھی عرج واقف تھے۔ آذر وہ کو ساری خوبیاں قدماہی کی شاعری میں نظر آئی تھیں۔ ہم مصرعہ جوائوں کے ساتھ ان کا قیہ  
 مرتبہ ہوتا تھا اور نہ جوائوں کی شاعری کو وہ بہت کم غلط میں لاتے تھے غالب آذر وہ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اور  
 آذر وہ بھی غالب کے ساتھ خلوص اور محبت کا تعلق رکھتے تھے غالب کی نظر خود اپنی ایک غزل پر پڑی تو ان کی ایک شکستہ سوجھا  
 ہوا آذر وہ کچھ غیر چرچا دینے کا اچھا موقع نکال آیا۔ غزل وہ تھی جس کا مطلع ہے :-

قلعہ معزیاں از خراب خادست فونی با بیاں فیض از فدا دست

اس مذہب میں کوئی غباری راستہ کی غزلیں ہیں اور پوری غزل پر نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کیوں نہیں غزل  
 نہیں جس پر غالب کو تذہب ہوا اور جس کو وہ کسی پندار کے ساتھ پیش کرتے ہیں ان کا اصل مقصد قطع پڑھ کر آذر وہ کو بے شمار  
 کن تھا پہنچے انہوں نے یہ کہ غزل سنانا شروع کی کہ دیکھئے کس ایرانی شاعر کی کئی اچھی غزل ہے۔ آذر وہ پہلے تو تعریف کرتے  
 مگر پھر کہتے کہ غالب کی غزل ہے اور خود ان پر چوٹ کرنے کے لیے سنانا جاری ہے۔ عسکر اگر کہنے لگے۔ کلام مرتبہ ہے،  
 مگر آذر وہ کا کلام سلام ہوتا ہے۔ غالب سناستے رہے، قطع پر پہنچے تو آذر وہ کی طرف خطاب کر کے مدعا تک آواز نہ اٹھا  
 تو نے کہ عمو سخی مستران چیشینی مباحث عسکر غالب کو در زمانہ دست

لوگ بہت متاثر ہوئے اور آذر وہ شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئے۔ غالب کا مقصد پورا ہو گیا۔ اس غزل میں ایک  
 مرد قابل انتہا شعر ہے جو قطع سے بھی زیادہ بیخ اور ٹکرا ٹکیز ہے۔ قطع میں ان بزرگوں کو غالب کیا گیا ہے جو اپنے زمانے  
 کے نوجوانوں کی غلط زندگی اور ان کے نئے کتابت میں صحت فاسیاں دیکھتے ہیں۔ دوسرے شعر میں نوجوانوں کو غالب  
 کہنے ان کا دل بھڑایا گیا ہے۔ بڑے نوجوانوں کے حوصلے بہت کمزور ہیں خود جوائوں میں ایسوں کی کمی نہیں ہو سکتا  
 کے کتابت سے غلط مددک اور بے جا بلور پر مرعوب رہتے ہیں اور جو کہ اپنے زمانہ کے نئے ٹکڑی سیلان اور کل انوار  
 کی دامن دور دست کے بلے میں شک ہوتا ہے۔ یہ بھی غلط سیلان ہے۔ غالب ہم کو سمجھاتے ہیں کہ زندگی ساری توانیاں  
 اور کوشش گنہ گار ہے جو اس کے ساتھ ختم نہیں ہو گئی ہیں جو کچھ پہلے کس قدر میں تھا وہ آج بھی ہے بلکہ پہلے سے چیز نور  
 بہتر ہے پھر یہ کیا کہ جب بھی باج کا خیال آئے تو عجبید کا ٹکڑا چھو جائے اور آواز کا ذکر کرتے ہی سکندر کے بھی گائے جائیں۔





کتنی ہی اور خوش آئند بات کہ گئی ہے جو زمانہ قبل تاریخ سے اب تک صحیح ہے اور بعینہ سے بعید مستقبل تک صحیح ثابت ہو رہی ہے  
کی گروہ شعر کہئے :-

بہائم و آشرف جم و سکندر و جمیت کہ ہر جہ وقت بہ ہر حمد و دروازہ وقت  
غالب آداب و ادب کی پادشاهی کو بہر حال ضروری کہتے تھے اور کسی صورت میں کسی قسم کی ناہنجاری اور  
پروہیزی گوارا نہیں کر سکتے تھے چاہے وہ بوزھوں میں ہو یا جوانوں میں۔ ایسی جوانوں کا دل بھلنے والے بڑھوں کو جس  
خوش اسلوبی کے ساتھ ان کی تنگ نظری اور ذہنی قہر سے انھوں نے آگاہ کیا ہے اس کو آپ سُن چکے ہیں اور جو ان کے  
حوصلے وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ اس کی مثال آپ کے سامنے ہے لیکن ایسے بڑھو غرض جو ان کی ان میں تصداف کافی ہے۔  
جو اپنے آپ کو ابد کی اصل عظمت کو تسلیم نہ کر سکیں ان کہتے ہیں جو ماضی کے زندہ اور توانا نقوش و آثار کو حسد سے بچتے  
ہیں اور جو اپنا خود مری میں تاریخ اور اس کے مسلسل کی حقیقت کو نہیں دانتے۔ غالب ایسے جوانوں کو دامنِ اور سخت  
لعجے میں ان کی پائی ہے تحقیق اور بے اعتباری سے خبردار کرتے ہوئے تنبیہ کرتے ہیں :-

ہرزہ شباب وہ ہے جاوہر شناساں ہر دار اسے کہ دور راہ سخن چوں تو جزا آمد و رفت  
پرانے دھروں پہ چھتے رہنا اور خود اپنے لیے اپنی زندگی کے مطالبات کے مطابق کوئی نئی راہ نہ ڈھونڈنا تو کلامی  
اور بہت کی برتری کی دلیل ہے لیکن ہمارے اسلاف جو راستے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق چکر چھوڑ گئے ہیں ان کو نگاہ  
میں نہ دیکھنا جیسا ہٹ دھرمی اور نا اگلی ہے۔ نئے راستے نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی طرح جانے اور سمجھنے۔ میرا  
پرانے راستے کب اور کب ممانعت و مزام کے درمیان کیسے نکالے گئے اسلاف کے طریقوں کی کو رائے اختیار نہیں  
غلط ہے۔ لیکن ان سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور اپنے دلوں اور انصوبوں کو تقویت پہنچا سکتے ہیں۔

سامعہ دھروں کی ایک تیسری جامع تالیف ذکر کیا جا چکا ہے جو مشورہ پیش ہوتی ہے اور کس طرح نہیں چاہتی کہ  
فیاض اس سے آگے بڑھے اور اس سے بہتر زندگی کے اسباب پیدا کرے۔ یہ جامع زندگی کی ترقی کے راستے میں مستقل  
خط ہے اس کو قدامت پرست یا رجعت پسند کہا جاتا ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ یہ لوگ وہ ساری آسمانیں اپنے  
لیے مہیا چاہتے ہیں جو جدید سائنس خود کی پیداوار ہیں لیکن وہ ان آسمانوں کو حاصل کرنے میں جس سوس و پیکا راہ میں  
محنت و مشقت کی ضرورت ہے اس میں حصہ لینا نہیں چاہتے اس لیے کہ وہ اس کی قابلیت نہیں دیکھتے۔ غالب جی  
سادگی اور خوش سلیکی کے ساتھ گمراہی سے قطعی اور صریح انداز میں ایسے جہڑگوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :-

ہاں میا و خراسانے پدر مستند آذر را تو ہر کس کہ شد صاحب نظر دین زندگان تو سخن نکر



یوں ہندوئی مذہب کو توڑنے کی ضرورت تھی ہوتی ہے۔ صاحب نظری کو حق حاصل ہے کہ گوروں کے لئے تاریخی  
میلان، واقفیت کے لحاظ سے ہندوؤں کے طریقے کا ناکارہ ہونا یا ان میں خاصا نہیں ہونا تو ان کا احترام کرتے ہوئے ان میں ترمیم  
افضا ذکر سے ان سے یکسر انحراف کر کے حکم سوادوں اور بدھروں کو یہ حق نہیں پہنچتا۔

اب آئیے غالب کے حوالہ دہان کے قریب ترین ماحول پر بھی ایک اجمالی نظر ڈال لیا جائے اور یہ بھٹکا کا کٹش  
کی بنا سے ان کے شعور کی بانی اور ان کے مزاج و کردار کی تربیت میں کن حالات و اسباب اور کون سے عوامل و عوامل  
نے ان کو یہ سمجھ لیا۔ وہ کس قدر زلزلہ سے مجبور ہے اور کس حد تک اپنی انفرادی شخصیت کے زور سے اس سے بلند  
پرتر ہو سکے۔

میں اس بحث سے احتراز کروں گا غالب کس میں کس تاریخ کو کس دن اور کس گھر میں پیدا ہوئے۔ یہ بحث  
میں لپٹا ہوا دوسروں کے لیے چھوڑاؤں جو اس کے لیے زیادہ معتبر ثابت دیتے ہیں اور جو اس میں خود حاصل کر چکے ہیں  
اس مسئلے میں جتنی بحثیں ہو چکی ہیں ان کی بنا پر ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ غالب ۱۸۵۱ء - ۲۱ دسمبر ۱۸۵۱ء مطابق ۸ - جنوری  
۱۸۵۱ء کیسے کے روز پیدا ہوا۔ ۸ - دسمبر ۱۸۵۱ء مطابق ۲۰ - دسمبر ۱۸۵۱ء چار شہر کے روز پیدا ہوئے لیکن جیسے لیے  
تو یہ تاریخیں غلط ہیں غالب بیسٹون اور بھرت و گھنٹے والا شاعر پیدا ہوا اور غلام اور خرد و فوں میں ایسا قابل فراموشی کا زمانہ  
میں پیدا ہوا کہ جو ان کی زندگی سے متاثر ہو رہے ہیں اور جن کا سوا کئے والے اور ان کے شعور کے دہوں میں ہمیشہ نیا ٹھکانا ہے۔  
پیدا کرے گا۔

غالب مختلف چرائوں میں بار بار یہ بات دہراتے رہے ہیں کہ وہ نسلا ترک ہیں اور ان کے اجداد کی زبان ترکی  
تھی۔ یہ بھی غلط بات ہے نہ ہندوؤں کی ہندی نژاد شعور کی عظمت اور بزرگی کا یہ نام مسلم ہے تباہی ترک ہی سے  
تعلق رکھتے تھے۔ میرزا و امیر خسرو، میرزا ابیدل اور غالب سے ہے۔ یہ بھی قابل غور واقعات ہیں کہ گوروں غالب امیر خسرو اور میرزا  
ابیدل کے پرستاروں میں سے تھے اور دونوں کے تادیبی کلام کو مستند اور سیاسی مانتے تھے۔

غالب کو اپنے ترک نژاد ہونے پر بڑا فخر تھا۔ وہ بار بار ایک ہندو کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ترکوں کے  
ایک سردار اور تہذیب کے تعلق رکھتے تھے۔ اس تعلق سے وہ اپنا خیر و شر مسلم و غیر مسلم کے واسطے سے قرار دیتا  
ہو اس کے باپ چنگ اور چنگ کے باپ زاد ختم سے ملاتے ہیں۔ اس طرح ان کا نسب نامہ تو توڑ توڑتے ہیں فریدوں  
کے بھی جانتا ہے اور ان کو۔ دہلی گھر سے ہے کہ دور مان جیشہ سے ہیں۔

ایک جگہ غالب اپنے کو ترکہ کا سردار بھی لکھتے ہیں کہ میں کو سو فیصد سے ان کے آباؤ اجداد سے ہوں۔



دوں ہی باتیں صحیح ہیں۔ غالب نے افراسیاب پر چنگ اودڑا تو ختم ہو گیا اپنا ٹھکانہ وہیں میں رکھتے ہوئے سوچتے کما ہوا گاہ و روز  
ہندوستان میں تو خود غالب کو شمال دیکھتے ہوئے صرف تیسری پشت تھی۔

سلطنتیں کا زوال ملک شاہ سلجوقی کی وفات کے بعد ہی شروع ہو گیا۔ اس کے جہاں نامزدنی اسباب تھے وہاں  
بہت سے خارجی اسباب بھی مہیا ہو گئے تھے جو تاریخی اہمیت رکھتے ہیں جس میں صباغ کے گروہ فرقہ یا عشیہ کے  
تھنے اسی وقت سر اٹھایا۔ حروب صلیبیہ کا جنگ امراسی دور میں شروع ہوا۔ اور صباغ سے بڑی تاریخی مصیبت اس  
زمانہ میں نازل ہوئی اور وہ تھا آداریوں کا اٹھنا جس نے مشرق اور مغرب کے اکثر تہذیب یافتہ اور بڑے امن و محاکم کو تھس تھس  
کر کے رکھ دیا۔

تاریخ بھی شاہد ہے اور خود غالب کے بیانات سے بھی اندازہ ہو گا کہ ملک شاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں  
جوخاں جنگلیاں ہوئیں اس نے سلطنتی اقتدار کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ ان بیٹوں میں ایک بیٹے برقیارق سے غالب کا بیٹا  
ورمیاں میں تھا۔ یہ جہاں اس زوال اور انتشار کا نتیجہ ہوا کہ ایک مدت تک طوائف الملک کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے  
بعد شاہی بیٹوں نے دلاور و چرخ و غالب کے بیان کے مطابق سلجوقیوں کے ایک گروہ نے خود جزئی اور ٹ مار کا بیٹا اختیار کر لیا۔  
لیکن ایک دوسرے گروہ نے موزانی اور کشادہ دہی اور سپہ گری کو اپنا قدیم معاش بنایا اور برتنہ میں رہ گیا۔ یہی لوگ راج  
راست غالب کے اہل و اقارب تھے۔ ان میں سب سے آخری مشہور شخص شہزادہ قاسم خان تھا جس کو غالب اپنا دادا جانتے ہیں  
تاریخی کتابوں اور تذکرہوں میں اس کے مفصل حالات نہیں ملتے۔

غالب کے دادا مرزا قوتان بیگ۔ قول غالب اپنے باپ ترکم خان سے ناراض ہو کر ہندوستان چلے آئے۔ یہاں  
غالب کی بعض تحریریں سے ایک تاریخی اہم نام پیدا ہو گیا ہے۔ سراج الدین محمد کو خدس میں ایک خط میں جلتے ہیں کہ مرزا  
قوتان بیگ ترکندہ سے ہندوستان آئے اور لاہور میں معین الملک کی جہاں اسی اختیار کی اور دولش کا دہائی کی ایک عیاریت  
سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا مرزا قوتانی بیگ۔ شاہ عالم کے صدر میں ترکندہ سے ہندوستان آئے۔ یہ شاہ عالم کون تھا  
اس کی تفسیر میں کسی کی گئی۔ اور نگ تریب کی وفات کے بعد اس کا بیٹا معظم بہادر شاہ اول اور شاہ عالم توی کے لقب  
سے تخت پر بیٹھا۔ اس کا عہد حکومت ۱۷۰۵ء سے ۱۷۱۳ء تک رہا۔ دوسرا شاہ عالم ثانی ہے جو عالمگیر ثانی کا بیٹا تھا اور جس  
کی حکومت ۱۷۰۷ء میں شروع ہوئی لیکن جو ۱۷۱۳ء میں کسی کوانی میں شکست کھانے کے بعد مجبور ہو گیا کہ انگریزوں کی  
پناہ قبول کرے اور تادم مرگ ۱۷۰۹ء تک ان سمندر پاری فاضلوں کا وظیفہ خوار رہے۔ برون اعظم دہلی میں مرج غالیات میں  
خاصی پرانی شہرت رکھتے ہیں جن کی کتاب غالب میں لکھتے ہیں کہ غالب معین الملک عزت پر مبنی تھے جن کے پاس غالب کے دادا



لاہور میں ملازم ہونے تھے۔ نومبر ۱۶۵۵ء اور محرم ۱۰۶۴ھ میں دہلی کی تخت نشینی سے گیارہ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ مرزا قوٹان بیگ اس سے بہت پہلے ہندوستان آچکے ہوں گے۔ مولانا غلام رسول امر کا خیال ہے کہ وہ محمد شاہ کے عہد میں دارو ہندوستان ہوئے۔ یہ زیادہ قریب قیاس ہے۔ محمد شاہ ۱۶۵۹ء میں تخت نشین ہوا۔ بہرحال آٹھ بیٹوں کے ساتھ لگا جاسکتا ہے کہ مرزا قوٹان بیگ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں ہندوستان آئے۔ ممکن ہے شاہ عالم اول کے آخری زمانہ میں آئے ہوں۔ لاہور راستہ میں بڑا تھا مسافرت اور بے وطنی کی مصروفیت زیادہ عرصہ تک نہیں برداشت کی جاسکتی۔ روزگار کی فکر دامن آج بھی اس لیے سب سے پہلے جو موقع ملا اس کو غنیمت سمجھا اور نواب حسین الملک کی ملازمت قبول کر لی اور نواب کی خدمت تک حق دنگ ادا کیا۔

نواب حسین الملک کی وفات کے بعد پنجاب میں اتھری پھیل گئی تو مرزا قوٹان بیگ لاہور سے واپس چلے آئے۔ شاہ عالم کی تخت نشینی کے بعد وہ انصاری اور مرزا نجف خان ہالہ کے مشیر ہو گئے اور ملازم اور امور و اختیارات انہیں کے ہاتھ میں آ گئے۔ مرزا نجف خان ایران کے شاہی خاندان صفوی سے تھے۔ ہندوستان آکر پہلے وہ شہنشاہ الدولہ کی خدمت میں رہے۔ کچھ دنوں بعد میر تقی میر کا بیٹا اور بیگال کے حاکم رہے۔ بلوچ کی وادی کے بعد آخر میں شاہ عالم کے ساتھ واپس چلے آئے۔ وہ جوہر شناس تھے۔ مرزا قوٹان بیگ کو انہوں نے اہل انصاف دیا اور پراساوی جاگیر ان کی کفالت کے لیے مقرر کر دی۔

مرزا قوٹان بیگ کی اولاد میں دو شخص ہمارے لیے خصوصیت کے ساتھ اہم ہیں۔ غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ اور چچا مرزا نصر اللہ بیگ جنہوں نے بھائی کی وفات کے بعد اپنے بھتیجے کی پرورش کی ساری ذمہ داری اپنے سر لی اور کافی سال کے بچے کو یہ نہ محسوس ہونے دیا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ہے۔ بعد اللہ بیگ اور نصر اللہ بیگ دونوں اپنے تعلیم آبادی پیشہ میں جہیز میں شہنشاہ کے دربار میں نام پیدا کیا۔ بعد اللہ بیگ کچھ دنوں نصف الدولہ کے ملازم رہے اور فوجی خدمات انجام دیتے رہے۔ کچھ دنوں بعد آہو میں قسمت آزمائی کرتے رہے۔ آخر کار اگرچہ چلے آئے جہاں ان کی خواجہ نظام الدین خان کی لڑکی سے شادی ہو چکی تھی۔ وہ اپنی سرسالی میں رہے اور یہیں سے راجہ بھٹنور سنگھ کے پاس ملازمت کی آفیدہ کر آئے۔ لکھنؤ میں سے ناکام واپس آئے۔ راستہ میں ایک بھائی زمیندار کی مرگ چلی۔ بے رہ ہوئے جو فوج میں بھی تھے اس میں یہ بھی اپنے رسالہ کے ساتھ شریک ہو گئے اور راجہ بھٹنور میں دشمن سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔

نصر اللہ بیگ مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ جب جنرل میک نے مرہٹوں کو شکست دی تو نصر اللہ بیگ نے غلو کی کئی اس کے ساتھ لکھنؤ میں صوبہ دار کی کشتی میں تبدیل ہو گئی تو کشتی اگرچہ تھوڑا دیر بعد نصر اللہ بیگ کے مستقبل



وہملاً نظر آنے لگا غیرت یہ ہوئی کوئی روزی و بھر کہ اور لوگ دو واسطے غلاب احمد بخش خان جن کی بھی مرزا نصر اللہ بیگ سے دوستی تھیں۔ انگریزوں میں بڑا دوستی اختیار رکھتے تھے۔ ان کی سفارش پر لارڈ الیک نے نصر اللہ بیگ کو انگریزی فوج میں پارو صوار کے ساتھ دس سالہ ری کے منصب پر مامور کر دیا اور آگرہ کے فوج میں سوئک اور دوسو سالہ کے دو پگنے ذاتہ و رسالہ کے خرچ کے لیے صحت مقرر کر دیے لیکن ابھی غلاب نے زندگی کے دس سال ہی دیکھے تھے کہ یہ ضیق بچا بھی لارڈ الیک کے ہمراہ لڑائی میں ہاتھی سے گر کر شہید ہو گیا۔

غلاب ہار پارہنی خانہ زانی خرافت و جلال کا ذکر فر کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کا یہ غریبے جان نہیں ہے۔ دلاویہاں اور نامہاں دونوں میں مرزا بانی اور سپہ گری کا پیشہ پشت و پشت سے چلا آ رہا تھا اور دولت و ثروت شوکت و سطوت دونوں گھرانوں کی کنیز تھیں لیکن آبا و اجداد کا وہ صد سالہ پیشہ جس پر غلاب کو اتنا فخر تھا ہندوستان میں صرف دو پشت تک چل سکا۔ پھر سپہ گری وہی مرزا بانی اور غلاب لاکو اس سے بے نیازی کا اہتمام کریں ہم یہ کہنے کے لیے مجبور ہوئے کہ شاعری ہی ان کے لیے قدریہ عزت رہی ہو آج ہم کو بھی ان کی شاعری پر فخر ہے اس لیے کہ شاعری بھی ان پر فخر کرتی ہے۔ غلاب نے شاعری میں جو عظمت حاصل کی وہ اس عظمت سے زیادہ اہم اور بڑا اور پیارا ہے جو ان کے ہونٹوں نے مرزا بانی اور سپہ گری میں حاصل کی۔ آج ہم غلاب کے آبا و اجداد کو غلاب کے حوالہ سے جانتے ہیں آبا و اجداد کے حوالہ سے غلاب کو نہیں جانتے۔ حالات بدلے بدل رہے تھے۔ ہندوستان کی غلامی کے سبب جزیرہ کشمیر اور پچھلے تھے مسلمانوں کے زوال کا کوئی تذراک نہیں تھا اندرونی اور بیرونی عوامل اس تہذیب کو بڑے اٹھانے لگے تھے جو مسلمانوں کی دینی تھی۔ غلاب کو اس کا شدید احساس تھا جو وہ کہ ان کے دل میں گھل پیا کر رہا تھا لیکن وہ جمہوریت اور انفعالیات کا شکار ہو کر نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ صاحب ہنر تھے اور خلاق ذہن رکھتے تھے۔ سکوار اور تیر کا پیشہ خانہ زانی سے جائیداد تو انہوں نے رقم کو اپنا تیسرا فنی بنایا کہ وہ نہ صرف ان کے لیے بلکہ آج تک جمائے لیے نازش و افتخار کا سبب ہے۔ غلاب خود اس کا بڑے پندار سے اظہار کرتے رہے ہیں۔ تمہرے روز کے دیباچہ میں ایک دہائی میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ لکھا ہے کہ کس طرح ان کے اجداد کا تو نام پورا تیر ان کے لیے علم ہی گیا۔

غلاب بہ گہر زود و دنا زاد شرم

تاں رو بہ صفائے دم تیغ است دم

چوں رفت پسہ بدی ز دم چنگ بہ شعر

شد تیر شکستہ شب گان مستلم



بہادر شاہ ظفر کی شان میں ایک فارسی قصیدہ لکھا ہے اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

سلبر قم بہ زرخسرد و خاقانیم بہ فن

توقیع میں بہ خیر و خاقان بہابر است

اسی خیال کو غزل کے ایک شعر میں یوں ادا کرتے ہیں:-

افراز کا وہ ترکان چشتی بر دند

بہ سخن ناصیر مستر کیا غم دادند

لیکن مبصروں سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ غالب کی نگرانی میں ایک مہاجر ازبکستان پیدا ہوا ہے اور ان کا شیرہ گھٹا ایک ترک ازبک سے جڑا ہے۔ یہ شاعر کا آبائی ترک ہے۔

جس ماحول میں غالب نے تربیت پائی اور جس حالات و موثرات میں ان کا شعور بالغ ہوا ان پر اجمال نظر ڈالنے سے ہم کو یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جس زمانہ میں غالب پیدا ہوئے اس سے پہلے اور اس کے بعد ملک کس جمہوری دور سے گزرا رہا تھا اور کیسے کرب و تشنج میں مبتلا تھا۔ آئیے اس پر بھی ایک طائر ازبک نظر ڈال لی جائے۔

سترہویں صدی کے آداب ترک اس برصغیر میں جس کو ایک پر قحان صدی سے ہندوستان کہتے تھے اور جو اب ہندو پاک کہلاتا ہے سلطنت اپنی حاکمات کس کس طرح قائم تھیں اور وہ تہذیب جو ہم طور سے ہندو تہذیب کہلاتی ہے لیکن جو دراصل گریانی سماجی تہذیبوں کے امتزاج کی پیداوار ہے نقطہ مزاج یا سمت اس پر بھی لیکن زندگی متناقص الاصل حقیقت ہے۔ ہندو اس کا مزاج ہے۔ شریعت یا دھرم اس کے غیر میں ہے۔ دنیا میں اب تک کوئی مذہب ایسا نہیں آیا جو یزبان و امیر میں غیر و شر و زور و تخت و دو متضاد قوتوں کے تصور سے پاک ہو۔ ہم کو کس دکن حد تک تاریخی جرئت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ ہر قوم میں خرابی کی ایک صورت سفر ہوئی ہے مگر یہ خرابی مخصوص بلازات نہیں ہوتی بلکہ تعویذ کا پس منظر برقی ہے لیکن وہ فساد و تشکیلات انتشار ترکیب و تحلیل ایک لاتناہی سلسلہ ہے۔ یہی ہر تہذیب تخلیق کی اصل فطرت ہے جس کا دور و زمانہ آتی ہے۔

ان تو افکار و رویں صدی کے ادبی دس سال ہی پورے نہیں ہوئے تھے کہ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ تمام حضراتی و قومی جو اب تک سخت بندھنوں میں بکڑی ہوئی تھیں مگر تاک لگانے میں تھیں تھیں، ایک ایک آزاد ہو کر اس دولت تیرہ کی سالمیت کو تھیں پس کر ڈالنے کے وہ پہے ہو گئی ہیں جو بارے برصغیر میں سلطنت اور مسلم ثقافت کی آخری وارث اور اہانت دار تھیں اور جس نے اس ثقافتی حرک کو نہتے نئے اقتدار سے لالہ مال کر کے دو سو سال سے کم عمر کا اندام مزاج ترک حکم منپایا۔



سلطنت تیمور کے زمانہ کو صرف بھٹائی سامراج کی فرضی برتری طاقت کا تجربہ کیا ایک عادت کی برتری ہے۔ اگر ہم صرف بیرونی اسباب و عوامل کو مسلمانوں کے زوال کا ذمہ دار قرار دیں تو یہ جانتے چوتھے کے لوگوں میں سب سے زیادہ قوی اور بیشمار سبب بھٹائی سامراج ہے۔ ہم نگار شاہ اور احمد شاہ ابدالی کو کسی نہیں بھلا سکے ہیں کے حملوں نے ملک کی ترن و زل سلطنت کو جز سے لکھا ڈھینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ لیکن یہی ساری حقیقت نہیں ہے۔ اندرونی خرابیاں ملک کی سیاسی اور مذہبی سالمیت میں فساد اور انتشار پیدا کرنے کے لیے بہت پہلے سے کام کر رہی تھیں۔ وہ تو اورنگ زیب کی جیل و پاب شخصیت تھی جو ان سارے فتنوں کو سر اٹھانے سے باز رکھے ہوئے تھی۔

لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد بہادر شاہ اول سے بہادر شاہ ثانی تک کیلئے کیا ہو گیا جس تہذیب اور جس معاشرہ کو پورے دو سو سال کی مدت میں چھ عظیم حکمرانوں نے پروان چڑھا یا وہ ٹھیک ڈھیر سو سال میں نو حکمرانوں کے عہد میں نمودار ہوئے ہیں۔ انگریزوں نے ہم کو کس کس طرح ہمال کیا؟ اس سے پہلے ہم کو یہ دال کرنا چاہیے کہ خود ہم نے اپنے سامراج کی کیا بیگانگی کی شکایت بعد کو کیجیے۔ پہلے ان کی خود غرضیوں اور فسادوں کا جائزہ لیجئے ہم اپنے تھے۔

اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوتے ہی کہیں نہ کہیں موبائی تعصبات کے پرست میں ذاتی مفاد پرستی نے زور پکڑنا شروع کیا۔ ہر مرید یاریہ کو شش کرنے لگا۔ گول سے ہانے ہم دفاداری قائم رکھنے کے لیے حقیقتاً اپنے صوبہ کو آزاد اور خود مختار کر کے چنانچہ نصف صدی کے اندر ملک کے وسیع ترین تین صوبے جگال، اودھ اور کن جو مختار ہو گئے اور صرف برکت کے لیے دلی سے اپنا تعلق قائم رکھا۔ اسی زمانہ میں مرہٹوں نے دلی کی بادشاہت پر قبضہ کر لیا اور کچھ عرصہ تک بادشاہ دلی کو اپنے قابو میں کر کے وہ اپنے حضور میں کالیاب بھیج دے۔ آخر کار انگریزوں نے ان کا قلع فتح کر دیا۔ پنجاب میں اور خود پر سکونوں نے اپنا اقتدار جاری رکھا تھا اور انگریزوں کی حمایت حاصل کر کے مسلمانوں کو اپنے مقام کا نشانہ بنائے ہوئے تھے ان کی وراثتیں اتنی بڑھ گئیں کہ آخر کار شاہ عبدالعزیز کو سکونوں کے خلاف جہاد کا فرائض دینا پڑا اور سید احمد شہید اور اس شہید اودھان کے بے شمار شاگرد ایک شہرہ آفاق جدوجہد کے حکم کے سکونوں کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان جنگ میں اتر آئے سکونوں کے پاؤں انگریزوں پر تھے۔ پشاور، مہابوں کے قبضہ میں آگیا تھا۔ سندھ، پنجاب اور افغانستان میں سکونوں کے خلاف غزوہ شریعہ رستا میں دشمن نے شکست سے بہت سے مہابوں ہی کو گذاری پر آمادہ کر لیا اور پھر انگریزوں سے فوجی مدد مانگی جو فوج بھیج گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لاہور کے تمام مسلمانوں کو شکست ہوئی اور سید احمد اور شاہ اسماعیل کے ساتھ کنوہر سے سرحد اور وہ مہابوں فرار ہوئے شہید ہو گئے۔ اس کے بعد سکونوں ہمیشہ انگریزوں کے حلیف اور حامی رہے صرف انیسویں صدی کے وسط میں چند سال تک سکونوں اور انگریزوں کے درمیان ملاپ تھا۔ انیسویں تا آج تک میں دو مہابوں نے



اپنے عاویس کو حکومت قائم کرنا چاہی۔ بات ملک اپنی طاقت کو فروغ دینے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ سراجپوت اپنے کو عظم  
کر کے دلی کی مرکزیت سے آکر دور ہو گئے تھے۔ امن انتشار پیدا کرنے والی قوتوں میں جیشتر انگریزوں کی حمایت حاصل کرنے پر بیچر  
تھے اور جس جس نے مرگش کی وہ انگریزوں کے ہاتھوں پہنچا ہونے اور ان کو بھی آخر میں انگریزوں سے مصالحت کرنا پڑی۔  
یہ اورنگزیب کی وفات کے بعد سے انیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں تک کی روداد ہے۔

غیر ملکی مداخلت اور اس کے مقصد اور ناکارہ ہونے سے پہلے ہم کو مختصر سے دل سے یہ سوچنا چاہئے کہ خود ہم نے اپنے  
ساتر کیا کیا۔ اپنی قیاد اور تہذیبی سالمیت کو کس طرح پرانندہ کر کے رکھ دیا۔ یہ سوچنا بہت ضروری ہے اور اس نکتہ پر وسیع کیے  
ساتر خود کرنے سے کچھ ہم بھی بہت فزاسیجیکر کھتے ہیں۔ اگر نے وہ کیا جو سوچ کر دگر سے نکلا تھا اور اپنے مقصد اور  
مشارکت کے لیے ایک بدگال طاقت کو کن پاجا چکے لیکن اگر خود ہم میں کمزوریاں اور دلی طور پر خدائی ہوتیں اگر خود ہم نے اپنی  
حمیت کو گھیر کر رکھ دیا اور تا کوئی بیرونی طاقت ہم پر غالب نہیں آسکتی تھی۔

انگریزوں اور انگریزوں کے تمام خطرات جھیلنا ہوا جاسے برصغیر میں تجارتی مراعات حاصل کرنے کی غرض سے اور  
یہ اس لیے کہ برصغیر حکومت کے آوازیجات بات ہے۔ کئی سال تک وہ سرگرداں رہا اور اس کو اپنے مقاصد میں کامیابی نہ ہو  
سکی۔ بڑی قباحتوں کے بعد انگریزوں نے سرحدوں پر جاکر اس کے دیوار میں تین سال وہ کامیابی نہ ہو سکی۔ اس وقت  
اور انگریزوں کا غلغلہ کھولنے کی اجازت دلا اسکا۔ کچھ عرصہ کے اندر جنوبی مشرقی ساحل پر بھی تجارتی حقوق مل گئے جنگل کے  
بلاتر میں بھی جنگل کے مقام پر جاکر اس کے زمین میں انگریزوں نے اپنا تجارتی دفتر کھول دیا تھا شاہ جہاں کے زمانہ میں  
جو سلطان شجاع کی عنایت سے کمپنی نے ایک فرمان حاصل کر لیا جس کی رو سے اس کو جنگل میں مل درآمد و پآمد کرنے  
کی سہولتیں دیا جوتین سوس کے لیے کمپنی کو ایک معمولی سالانہ رقم شاہی خزانہ میں داخل کرنا پڑتی تھیں۔ اب تک یہ سارے  
اوقات تجارتی تھے۔ لیکن پچیس سال کے اندر یہ انگریزوں کو روک کر پڑنے سے نکالنے لگا اور ہم پر یہ حقیقت ظاہر ہونے لگی کہ وہ  
بغیر سود گری کی غرض سے ملکہ حاصل سیاسی مقاصد اور استواری منصوبے کے ہاتھ ملک میں داخل ہوا ہے۔ اس کی  
علامتیں ہو گئی ہیں کہ وہ نے میں سے ظاہر ہونے لگی تھیں۔ اسی اورنگزیب کو تخت پر بیٹھے ہوئے مشکل سے تین سال  
ہوئے تھے کہ کمپنی کے ارباب دحل و حلقہ نے مثل سرکار سے اخراجات کا ثبوت دینا شروع کیا۔ یہی کے گورنر نے کمپنی کے ارباب  
کو ملکہ کی بات وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی تجارت کا انتظام ہاتھوں میں سوار کر لیں۔ یہ تجویز سب نے پسند کی اس بدل  
ہوئی حکومت ملکہ کا نتیجہ تھا کہ ۱۷۰۷ء میں کمپنی اور سود گری بند لگا دیں کو گھیر کر کمپنی کے حکام نے سرکار کے ہاتھوں کو کامیاب  
کو کر خریدنے سے ہمارے تھے پکارا گیا وہ یہ بھولی مجھے کہ دلی کے تخت پر اورنگزیب جیسا بادشاہ بیٹھا ہوا ہے جس کی تہرکی





مرکشی برداشت نہیں کر سکتا۔ اورنگ زیب نے کپہنی کو اس دست و دوزی کی سخت مزاحمت کی اور کپہنی کو فتح و مغرب و مسافرت کا  
مخلی مرکز کے حضور پیش کرنا چاہا۔ کپہنی نے سات سرکاری جہاز آزاد کر دیئے اور ڈیڑھ لاکھ روپے تعاون دیئے۔ بادشاہ نے  
کپہنی کا جرم معاف کر دیا اور اس کے تھکاتی حقوق بحال کر دیئے۔

بنگال میں بھی اسی زمانہ میں احسان فراموش کپہنی نے مرکشی شریعہ کی - باوجود اس کے کہ شائستہ خان نے اس کو  
معمول دشوم سے بھی مستثنیٰ کر دیا تھا - اس کے سر میں یہ برائیاں کرنا اپنی طاقت سے اپنی مخالفت کرتا پایا۔ اس غرض سے  
اس نے جنگی میں ایک فوجی حصار تعمیر کر لیا۔ لوہنگی کی آبادی اور شاہی قلعوں پر حملے کرنے لگی۔ اورنگ زیب نے اس قدر  
کی بھی سرکوبی کی بلکہ وہاں بھی جب کپہنی نے مسافرتی قواں کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ مغرب و عطا کے جوڑ میں مزید جہاد  
مراعات دی گئیں۔ دہلی کے وہ لوگ اس ماحمت علی جبکہ ۱۶۹۰ء میں کپہنی نے بنگال میں تین ہفتے کے حقوق زمینداروں حاصل  
کر لیے۔ ان میں ایک دفعہ کالی گھاٹ تھا جس کو انگریزوں نے لگاؤ کر لکھتے کر دیا۔ یہ نام ایسا مشہور ہوا کہ آج کل کے عوام اس  
کے اصل نام سے ناواقف ہیں۔ ان کو یہی پروفیز ہند پاک میں دولت تعمیر کے انتہائی طرح کی تاریخ ہے اور یہی بھارتی  
سامراج کے منسلک بنایاؤ کی تاریخ ہے۔ اس کے بعد کپہنی نے اپنی طاقت کو بنگال میں مجتمع کرنا شروع کیا اور لکھنؤ کو اپنا فوجی  
مرکز بنا کر سامنے ہند پاک میں سامراجی اقتدار قائم کرنے کے لیے ریشہ و دنیاں شروع کیں۔

اس کے بعد کہ اسان ملک میں بھارتی استعماریت کے تاریخی تسلط کی داستان ہے جس کے کسی دیکھ بھنگ  
ہم واقف ہیں۔ اورنگ زیب کے جانشین کنور سے کنور تر ثابت ہوتے گئے۔ دزد اور امرا میں خود غرضی میں کوشی  
اور باہمی منافقت اور سازش آئی گئی۔ احمیاں و دربار کو اس کی بالکل فکر نہیں رہی کہ سیاست ملی کا شیرازہ بکھڑا ہے اور  
مسلم سلطنت اور تہذیب کی سالمیت اور مرکزیت خطرہ میں ہے۔ وہ میں ذاتی مفاد اور بہبود کی جنگ میں رہنے لگاؤ اور  
میں بکھڑنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت بکھڑنے لگنے لگی اور جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ہر صوبہ بیلار اپنے صوبہ میں آزاد  
حکومت قائم کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ یہی نہیں کیا بلکہ ہر صوبہ اپنے ہمسایہ صوبوں سے آمادہ پیکار رہنے لگا۔ اس کے لیے  
بہاؤ وقت انگریز سے فوجی مدد مانگ جانے لگی اور انگریز فوجی استعداد سے کبھی ایک صوبہ کی کبھی دوسرے صوبہ کی مدد کر دیا۔  
ہم آج اس میں اٹھتے رہے اور انگریزوں نے میں ہماری مدد کر دیا۔

قصہ مختصر جو ان دنوں ہمارے ہر ذہن میں انگریزوں کے سامراجی اقتدار کو پھیلاتا رہا اور اس کو مضبوط و مستحکم بناتا  
رہا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ نے اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ نے فیصلہ کر دیا کہ اب ملک ایک غیر ملکی طاقت کی گرفت میں  
آچکا ہے اور پڑا سامراجی نظام اور پشت و پشت کا دورہ ماحشر و دم توڑ چکا ہے۔ پاس کی شکست کو تو ہم انہوں کی سازش



اور خدای سے فسوب کر سکتے ہیں لیکن بکسر میں میر تقی میر نے نواب بنگال شہنشاہ اورنگ زیب اور بادشاہ شاہ عالم ثانی کی متحدہ طاقتوں کی شکست انگریزوں کی عسکری فوقیت اور ان کے امتیاز سیاسی اور مذہبی کی ناقابل تردید علامت ہے۔ کلاں جو جب اپنے ملک کو دیکھا گیا تو وہ اس ملک میں انگریزی راج کی بنیاد اس طرح راج اور مضبوط کر چکا تھا کہ وہ ہزاروں سال نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس کے بعد کے بیس ایک سال صرف برطانوی اقتدار و اختیار کی توسیع و ترقی کا دور ہے۔ اس دوران میں نظامی و عسکری انگریزوں کا حلیف ہو چکا تھا۔ سکھ انگریزوں کے ساتھ تھے۔ دو عہد طاقت سلب ہو چکی تھی۔ اور وہ کی صورتوں کو اگرچہ ابھی نصف صدی سے زیادہ مدت باقی تھی لیکن جہل عمل متصادم اور مفادات کا جہاں تک تعلق ہے اور وہ کلاں انگریزوں کے لشکر میں تھا اور ہجرت اب اس قابل نہیں رہ گئے تھے کہ کبھی کمپنی کے خلاف سرخا سکیں۔ غرض کہ ۱۷۵۷ء میں جب لارڈ ولزلی گورنر جنرل ہوا تو ملک میں برطانوی استحکام و استحصال جڑ پکڑ چکا تھا۔ یہی زمانہ نواب کی پیدائش کا ہے۔ پھر ایک چوتھائی صدی انگریزوں کے اہمیتان و استقلال اور اس دکن کا زمانہ ہے جس میں وہ بارہا پنج قوت کو مجتمع اور وسیع سے وسیع تر کرتے رہے۔

۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک انگریزوں کے لیے پھر اضطراب اور بے اطمینانی کا دور رہا۔ اگرچہ اس دور میں جمی ان کے اختیارات بڑھتے اور وسیع ہوتے رہے لیکن اب ان کے لیے وہ جہیں نہیں رہا۔ انگریزی ہری جنگ اس دور میں ہوئی۔ نوابوں سے عداوت اب اس زمانہ میں جو، امتحانوں کے ساتھ پہلی لڑائی انہیں دونوں میں ہوئی۔ منہ پر قبضہ اس دور میں ہوا۔ سکھوں سے دو دفعہ مقابلوں کا یہی زمانہ ہے۔ آزادی کی کڑی تحریکیں بھی شدت کے ساتھ اس دور میں چلتی رہیں۔ بالاکوٹ کی شکست کے بعد ہی وہاں کی تحریک چلا دے گئے اور ڈھاکہ تک زور پکڑتی رہی۔ انیسویں صدی کی پہلی ہی دہائی میں سیاسی شریعت اللہ نے ہندوستان کو دارالحرب اور جماعت کی نواز کو منسوخ قرار دے دیا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے فتنہ انجمنی تحریک چلائی۔ ان کے پیچھے اور دانشور و دھرمیان نے مشرقی بنگال میں اس تحریک کو قوی اور شدید اور مقبول قرار دیا اور اس کو باقاعدہ تنظیم کیا۔ انہوں نے پہلے مشرقی بنگال کو ملحقوں میں تقسیم کر کے ہر طبقہ کے لیے ایک خلیفہ نامزد کیا اور طریقہ کار کا ہوا پر بارے علاقہ لا اختلافی جماعت کے ہاتھ میں دے دیا۔ انگریزوں کی حمایت اور مخالفت میں چند زمیندار غریب مسلمان کلاں پر جو چڑھتے اور دھڑک رہے تھے اس کی سخت مخالفت شروع کی اور لگان نہ دینے پر اصرار کیا۔ بلکہ جگہ زمینداروں کا لشکار میں منگوا دینے لگا۔ جو اگر ٹھہرے کی صورت میں رد نام ہو رہا تھا۔ اس تحریک کو شہید محمد شہید کے ایک مرتد شاگرد ملے اور بھی تقویت دی۔ سوچوں اور خفاہوں کی بدولت پہلی جنگ آزادی سے چند ہی سال پہلے کی بات ہے۔ اور وہ کلاں اس جنگ آزادی سے صرف ایک سال پیشتر کا واقعہ ہے اور پھر ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۸ء تک کشت و خون اور لڑائی مار کا جو



بلانا درگم رہا جس کی رد واد سے ہم ابھی طرح واقف ہیں۔

یہی وہ نصاب جس میں غالب نے آٹھویں کھولیں باغ ہوئے اور آواز مٹشوں کی زندگی بسر کی۔ وہ کس طرح وکروار کے آدمی تھے؟ اس کی طرف مقلد میں کافی وضاحت کی جا چکی ہے۔ اب ذرا یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ ان حوادث کے درمیان ان کا رد و عمل کیا تھا۔ غالب کو سلطنت منلیہ اور اس کی پروان چڑھائی ہوئی شہنائی میراث کے ضائع ہو جانے کا براہِ خلق تھا ان کے خطوط سے اس کا بہت صاف اندازہ جرتا ہے۔ ایک نثر و قطر بھی اس کا یہی ثبوت ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

بس کو فعال مایہ ہے آج

بہر سلسلہ شور انگلستان کا

لیکن غالب صرف تلق کر کے یا اچھل کر رہ جانے والوں میں سے نہیں تھے۔ پتیل ہم کو یہ تسلیم دے گئے ہیں کہ انہیں نامید ہیں کا شکار ہو کر نہیں رہ سکتا۔ کہتے ہیں:

دل دم آرزو مشکل بود مجبور سو نومیدی کرسنگ ایں جا ضروری گرد و از دست گیندا

یا

شوق و اماندی نصیب مباد دل افسردہ نالا و گراست

غالب کا بھی ایک شعر ہے جو نثر و شاعری کی کائنات میں ایک بالکل نیا تخلیق ہے اور جس میں انہیں کی عظمت کے اسی نکتہ کو بیان کیا گیا ہے۔

ذاتی شوقی اغریشہ تاب رخ نومیدی

کعبۂ انوس فنا عہد محمد یہ قست ہے

گذشتہ چالیس پینتالیس سال سے اہل تحقیق اور ادب باب تنقید میں ایک بیہ میان مام ہو گیا ہے عظیم شخصیتوں کی زندگی والوں کے کردار میں نقائص و صوفتے جائیں اور ان کی عظمت میں رخنے پیدا کیے جائیں اور اس طرح خود اپنے کو منفرد اور ممتاز ثابت کریں۔ غالب بھی اس تحقیری تحقیق اور تفرصی تنقید سے محفوظ نہیں رہے۔ ویسے تو ان کے ذہن میں یہ اعتراضات جھٹکتے رہے لیکن ان کا اہم غرض یہ نہیں تھا کہ ان کے غلب پر تنقید کرتے ہوئے کچھ کہیں بلکہ ان کا مقصد صرف تنقید ہی نہ تھا بلکہ صاف تمام احترام کا میلان لیے ہوئے ہوتا ہے۔

غالب مقروض رہتے تھے۔ غالب شراب پیتے تھے۔ غالب فحاشیاں بڑھتے تھے اور بڑے نہیں دیکھتے تھے۔

قبل کی زندگی سے بچاؤ مانگتے تھے۔ یہاں لوگوں کے عائد کیے گئے اعتراضات ہیں جس میں کچھ تو جی نہیں آتیں مگر ان میں جتنی



غالب کہ درخش برے لالہ پیار کے ساتھ ہوئی تھی اور ان کا دل بھی نعمتوں اور فخر و شہرت میں گنبد تھا۔ اور حیل اور تامل دونوں طرف سے اسی زاویہ سے تھے۔ ایسے طے کے مشابہہ لالہ ہو جاتے ہیں اور غالب نے بھی خروج میں بد عنوانیاں کی ہیں مگر بہت بعد تحصیل گئے۔ ان کی تیز بصیرت و فہم کی اجرت کی کوٹھی عبرت کے ساتھ دیکھ کر ہی تھی۔ پھر وہی آکر ان کو ٹہی سے بڑی برگزیدہ ہستیوں کی محبت نصیب ہوئی جن سے انہوں نے جلا حاصل کی اور یہ ہستیاں غالب کے ساتھ شفقت اور عزت کا ہر گنا کرتی تھیں۔ ان مرثیات نے غالب کو بچنے نہیں دیا بلکہ اپنی مرثیت کو کیا کرتے جو صمد و نہایت اور کشادہ ہاتھ رکھتے تھے اور اب وہ مندرجہ بالا کا لازمہ نہیں تھا۔ خارج آگئی تھی زیادہ تھا، قرض نہ لیتے تو گناہ کیسے جوتا۔

غالب خراب پیتے تھے، ان صاحب پیتے تھے پھر

”وہ کون تھا جو خرابات میں خراب د تھا“

غالب نے اس کو بھی نہیں بچایا بلکہ شراب پیتے نہیں تھے اس سے زیادہ اس کا ذکر فرما کر تھے غالب

نے اپنی شراب نوشی کی وجہ بتائی ہے

مے سے مرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو

ایک گنہ ہے خودی مجھے دن رات جا پیتے

اس شعر میں جو غلاب سے زیادہ قابلِ مبالغہ ہے وہ ایک گنہ ہے۔ غالب اپنے ظرف کی مناسبت سے اپنے لیے ایک مقدار شراب کی حد پر نہ تھے۔ وہ بھی بدست ہو کر بچکے نہیں اور انہیں اپنے ساتھ دوسروں کو شراب پینے کی ترغیب دی وہ جو کچھ اپنے لیے تھے۔ وہ گناہ و ثواب کے دائرے واقف تھے اور انسان کی گزروں کو انسانی سطح سے دیکھتے تھے۔ ایک تاجیک شاعر نے مرزا بیگ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہی ہم غالب کے بارے میں کہیں گے۔

ذ صوفی ہونے ثلثا نہ ہے توفیق روحانی

فقط ہی کر بر و نسب انکو با چشم انسانی

غالب پر آج کل ایک عام اعتراض یہ ہے کہ وہ انگریز نظام کی خوشامی کرتے تھے۔ ان کی شان میں تعہد کرتے تھے۔ یہ کوئی بجا جرم نہیں ہے۔ وہ رنگارنگ تلاش یا دلچسپی کے طلب میں آج ہم آپ بھی بھی کریں گے۔ ان عزم و جلاہا ہوگا۔ غالب کے ۶۲ غامی قصائد میں صرف متروک تعہد سے اور اردو کے حدود سے چند قصیدوں میں صرف دو ہی صلیک تعہد انگریزوں کی مدح میں تھے ہیں۔

لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے غالب بہت دیر عرصہ نہیں تھے ان شاس تھے۔ ان کو غم تھا کہ نکلے معاشرہ والا



قمری وہ ہم پر ہم بردار ہے۔ لیکن ان کو یہ بھی احساس تھا کہ واقعی نظام زندگی میں تعقل کی جگہ شکر و سپرد ہو گیا ہے اور اس کے اندر بقا اور ترقی کے آثار باقی نہیں ہیں۔ بر خلاف اس کے وہ انگریزوں کی ہنسندیاں دیکھ رہے تھے اور ان کے اجتماع دو رعباد پر مشتمل کرتے تھے۔ انہوں نے اس ملک میں کیسے کیسے اسباب ترقی پیدا کیے ہیں۔ غائب نے ان کو اس ترقی یافتہ دنیا سے جو سرست کی شانیں کردہ آئین اکبری پر کھینچی گئی ہے، ظاہر ہے کہ انگریزوں نے یہ سب کچھ اپنی سامراجی جبر و کدے پائے کیا لیکن وہ چاہے لیے بھی خیر و برکت کا ذریعہ ہی گیا۔ غائب چونکہ آئین پڑھا کے دشمن تھے اور وہ بدعتی ہی کی نفرت کے خلاف تھے اس لیے دشمنی کے اقتسابات کا بھی دل سے اعتراف کرتے تھے اور چاہے دل میں نیا دلولہ اور قلعہ کار پیدا کرنا چاہتے تھے۔

غائب اپنے مراسلات و مکالمات اور اپنے فارسی اور اردو اشعار میں بار بار اپنی آرزوئی اور آزادی پر ناز کرتے ہیں اور یہی ان کی شخصیت کا اصل جوہر ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

ہندوئی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں میں کوہم

اٹلے صبر آئے در کعبہ اگر وا نہ چلائی ان کا دروازہ

ایک فارسی شعر میں مبارز ظہبی کے انداز میں کہتے ہیں :-

بصورت غائب آزادہ را و پاک دار

بشرط آن کہ تو ان گفت تا مسلمانان

یہ بہت بڑی عکاسی ہے غائب اپنے کو مسلمان سمجھتے ہیں اور اگر کسی کو اپنے مسلمان ہونے پر اصرار ہے تو اس کو مسلمان کہتے ہوئے بڑے سے بڑا ملحق اپنی زبان میں نکلتا محسوس کرے گا۔ تکفیر ٹریڈ مارک کا کام ہے۔

ایک اور شعر میں غائب اپنے کو کھٹکے الفاظ میں آرزو مڑا گئے ہیں اور اس کے مسلمین خدا سے اپنی منفرت چاہتے ہیں اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکے گا کہ اردو شاعری کی زبان میں غائب سے بڑا مڑا آزاد پیدا نہیں ہو سکتا اور یہ درنگ آزادی ہے جو غائب کو زمانہ سے بلند کیے جیتے ہے۔



# غالبے : فکر و نظر

شعر غالبؔ زبور وحی و نہ گوئی مے ولے

تو ویر و دان توکل گفت کہ الہامیہ جست ؟

غالبؔ نے نہ جانے کس خیالی کتہ تحت وحی اور الہام کے اصطلاحی فرق کو درمیان میں خاندنزدہ لگا دیا۔ ہم اس بحث کی روشنی افروز کو مابعدوں کے لیے چھوڑتے ہوئے آئندہ خود ہمیں ملے کہ اگر زمین پر وحی آکر سکتی ہے۔ اگر خدا کی کلمی کو ہی ہو سکتی ہے کہ پتھروں اور دھاتوں پر چھتے بنائے تاکہ انسان کے لیے شفا بخش مشروب مایہا ہو سکے تو انسان تو اس طرف غلط فہم ہے۔ وہ بھی وحی کا حامل ہو سکتا ہے اور ہو تا ہے اور اگر حق کے نفس کو توغوی اور فاجر کے نفس کو فوجی کا الہام ہو سکتا ہے تو شاعر کے نفس کو شعر کا بھی الہام ہو سکتا ہے۔ وجہ کے مختلف مارج ہیں اور شعور کی مختلف سطحوں پر وہی الہامی کی نوعیت اور اس کی غایت یا افادیت مختلف ہوتی ہے۔

میں اس سے پہلے بھی اس نکتہ کی طرف توجہ دلا چکا ہوں کہ دنیا کی کئی تہذیبوں میں شاعر کے حترادوں پر غماز ہوتے ہیں ان کے اصل معنی ایسے ہی شخصی کے ہیں جو توفیق خداوندی یا سرب کا حامل ہو جو دانے اسرار کائنات ہو جو اسی چشم دینا رکھتا ہو کہ ان حالات و ذوال دوران کے مواقف کو دیکھ اور پہچان سکے جو ابھی عوام انسان سے پوشیدہ ہیں۔ عارف معین دانشور ہمیشہ ہیں۔ یہ ہیں ان زبانوں میں اس خاندن کے سب سے شاعر کی جگہ داغ رہے ہیں۔ انگریزی زبان میں (POET) جس کو نانی حفظ سے مشتق ہے اس کے معنی غافل یا غافل صانع کے ہیں۔ شاید نہ کچھ بجزوردی کے ذہن میں تھا جب کہ انہوں نے کہا کہ انگریزی کی قدر تہذیب صفات باری میں سے ہے شاعر کو بھی انسانی کی گنتی ہے جہاں انسان کا خاندن نے وحی میں پوشیدہ حسن آفرینی میں مصروف ہیں۔ شاعر نے کام مل اعلان کرتا ہے۔ اسی تصور کے تحت رابرٹ براؤن ٹیل نے خدا کو شاعر کو مکمل کہا ہے اور اسی لحاظ سے ڈاکٹر بجنوری صاحب کو ایک رب الخالق تسلیم کرتے ہیں۔ قدیم لاطینی زبان میں واتیز (VATES) تھی اور شاعروں کے لیے استعمال ہوتا تھا جو خدا کو شاعر کے معنی میں مراد آگاہ کے ہیں جو دوسروں کو فوجی آگاہیوں دے سکے۔ شاعری و خبری کا جزو ہے۔ یہ فارسی میں ضرب افش قول ہے جو معانی سے لیے ہستہ پڑا جو چکا ہے اور پھر سامنے کی بات ہے۔ ہم



شعر کے سلیس میں آثار اور ادبی اصطلاح میں زبان کے کب سے استعمال کرتے آئے ہیں۔ اور وہ محنت کاوش تکلف کا  
اکتاب ہے لیکن آثار شعر کی شعری ماہیت ہے وہ بے اختیار اور بے ساختہ اندوئی تحریک ہے جس کا دوسرا نام دمی یا  
الہام ہی ہو سکتا ہے۔

گوئی میں بہت سے شعرا ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے بلند آواز میں یا زیر لب شاعری کو ہاتھ یا غیب کی آواز بتایا ہے اور  
جب شاعری کو طیف دیا تو نئی تشبیہ جذبات کا یہ سخت سیاق لاقتا ہی باہمی طور پر جنگ و یوانی جیسے بہم فکروں سے  
تعبیر کیا گیا ہے تو یہی معلوم دیتی، الہام یا القا ہی رہا ہے۔ خالق اور شیدہ (جو نہی و نواز چہر) کے شعور، سہارہ نہیں عبد العظیم آس  
جڑے ہرگز یہ شخص اور بالکل شاعر گڑ سے ہیں وہ شاعری کے بارے میں صاف صحت کہتے ہیں  
شعر گوئی نہ سمجھنا کہ مرا کام ہے یہ

قالب شعر میں آس فقط الہام ہے یہ

غالب نے بھی شاعری کو ایسی شاد و سرگوشی صراحت کے ساتھ غیب ہی کی آواز بتایا ہے۔ ان کے ایک شعر کو میں  
مضامین ناچکا ہوں، اور وہ میں یہ قطع خاصانہ غالب میں غریب الش ہے  
آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

غالب صریح نام نہ تو اے سرو دش ہے

مجاہد احمد کو فارسی زبان میں اپنا استاد مانتے ہوئے غالب کو اصرار ہے کہ شاعری میں تو جو کو بہ انیاض کے ہاں کسی  
سے کہتے نہیں ہے بلکہ فارسی شعر میں کہتے ہیں۔

آچہ در میدان فیاض بود آبی من است

میں جو ناشدہ از شاخ ہدایا من است

اور اس شعر میں اس خیال کا دوسرے پہاڑ میں اظہار کیا گیا ہے۔

دگر ہمارے طبع اور آب تیا س آئینہ

نفل دو خاطر اہل بیباں اندونہ

حقیت نظر اندازی کے آخر میں جو تقریباً ہے اس میں ایک نہایت ہی سے انداز ہر کا ہے کہ خود غالب کے خیال ہی  
ان کی شوقی تاثیر تو بخوبی قرین کار دیکھا تھا اور وہ اپنی شاعری کو کیا کہتے تھے۔



گردوق سخن پہ ہر آئیں بودے

دیوان مرا شہرت پہ دیں بودے

غائب اگر ایں فن سخن دیں بودے

اکیں دیں را از دی کتاب ایں بودے

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ غائب نے اس زمانے میں اپنے جن دیوان کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ وہ ان کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے لیکن وہ اپنے اردو کلام کو بھی الگ نام سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ جن کا ایک مشہور اردو شعر تھا چکا ہوں۔ ایک دوسرا شعر ہے جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اپنے کلام کو غزلیات سلوی سے بھی کچھ افضل سمجھتا ہے۔

پاتا ہوں دلو اس سے کچھ اپنے کلام کی

روح القدس اگرچہ مرا ہم زبان نہیں

انہیں اشارات کے زیر اثر ڈاکٹر عبدالرحمن مجذوری کی زبان سے وہ جملہ نقل کیا جو اپنی بزرگ خود میں ایک ایسی نقل کا حکم لکھتا ہے اور جواب تنقید غائب میں لکھا یہی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔

”ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ وہ مقدس اور دیوان غائب“

غائب فن شخصیتوں میں سے ہیں جو فکر و اظہار کی تاریخ میں مہجرات یا نئے آفات کی سرحد ہوتی ہیں جو ہم کو نئی سمت میں مڑاتی ہیں اور نیا راستہ دکھاتی ہیں۔ میں آج سے بہت پہلے کئی محققوں نے غائب کو اردو کا چارہ نظر شاعر کہہ چکا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ غائب خیابادی طور پر صاحب نظر اور فکری ہیں۔ ان کے کلام میں اردو جو فارسی کا ایک نیا زاویہ نظر اور ایک نیا انداز فکر رکھتا ہے اور پہلا دھڑکی ہے کہ وہ جس زبان کے بھی شاعر ہوتے مگر بعیرت میں اپنی انفرادیت اور ایک نئی کی بدولت متاثر رہتے۔ ان کے فارسی اشعار بجا و بیان میں آئیں گے اور ان سے اندازہ ہوتا جائے گا کہ ہمارے دینی کہاں تک حق کا تاب ہے کہ غائب جس زبان کے بھی شاعر ہوتے اپنی کائناتی بعیرت اور ضمنی باب فکر کی چارہ خزاںوں میں پہچان لیے جاتے۔ غلام میں بھی غائب کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو نئے افکانات کا درجہ رکھتے ہیں لیکن آئیے تھوڑی دیر کے لیے ہم صرف ان کی اردو شاعری تک اپنی نظر دوڑا لیں اور دیکھیں کہ اردو کو ان کی شاعری نے کیا دیا۔ غائب پہلے اردو غزل یا قوافی خاص جذبات کی شاعری تھے اور اس میں داخلیت کا زور تھا اور اس داخلیت میں بھی انفرادیت کی فضا چھائی ہوئی تھی یا پھر ضمنی اور جزات کی غائبانہ اقصیت کو قبول عام حاصل تھا لیکن غائب کے زمانہ میں دیوان شاعر کی شاعری سب سے زیادہ مقبول ہوئی تھی جو دور ان کا طرز آفرین اور عقلی زور آزمائی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ غائب نے اردو غزل کو بحال داخلیت اور سطحی خارجیت دونوں کے سنگ داروں





بے تکلف و نفرت خانی ہے قریب کر دیا اور غزل اپنی شکل و زبان اور سبب و طرز بیان کے باوجود اردو شاعری کو بڑھتی ہوئی جماعت سے بچا کر اس کے اندر مسزئی و گم پیدائلیوں کے کھنجر و شکاروں کی ایک پٹی چلائی۔ یہ بھی دیکھ کر وہ اپنی فکری اور سیرت سے اس صنف کے نئے ابلاغ و امکانات کو پانچتے ہیں جو صدیوں سے استعمال ہوتے آئے ہیں اور ان کو زندگی کے نئے روز و نفاذ انعام کے لیے نئے قرینے سے استعمال کر کے ان کی معنویت کو بڑھاتے ہیں۔ غالب نے بھی یہ کیا ہے اور ان کو خود اس کا اعتراف ہے۔ ایک قصیدہ میں جو نعت اور شہادت پر مشتمل ہے کہتے ہیں۔

لفظ کمن و منن تو در ورق می

گوئی کہ جہاں است و بہار است جہاں را

غالب دنیا کے ہر بڑے شاعر کی طرح خیالی اور پر داخل صنف کے شاعر تھے اور اس صنف میں بھی اس نعت صنف کے شاعر تھے۔ مگر غزل کے لیے یہ خاص اور داد کے سوا کوئی کلمہ نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غزل میں کوئی دشت نہیں ہوتی۔ یہ سچ ہے کہ غزل کا ہر شعر ایک مکمل اور حفر و مضمون اور اپنی جگہ ایک اکائی ہوتا ہے اور بیجا پروری غزل میں کوئی وحدت نظر نہیں ہوتی بلکہ حقیقتاً اس میں بڑی دقیق وحدت ہوتی ہے اور یہ وحدت مرکب اور پیچیدہ ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک غزل ایک ہی شاعر کی کہیں ہوتی ہے اور اس کے خراج کی کائنات سے آئینہ دار ہوتی ہے۔ غزل سے شاعر کی پوری فردیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے پھر غزل میں کافیہ کی وحدت ہوتی ہے اور سب سے چلتے تو اس سے یہ چلے جاتا ہے کہ کلام صرف کافیہ بند شاعر ہے اور کس کا ذہن ایک کافیہ سے کسی خاص معنی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ مثلاً ایستائے ذہنی (MENTAL ASSOCIATIONS) کا بہترین امتحان ہیں اور ان سے شاعر کے پورے شعور کا قیاس لیا جاسکتا ہے۔ یہی ہے عمل گندہ میں ایک مرتبہ ایم۔ اے کے حوالے سے کہا تھا کہ شعور کی رود (STREAM OF CONSCIOUSNESS) کو سمجھنے کے لیے دور جاننے کی ضرورت نہیں۔ اس کی نہایت معصوم اور بے ساختہ مثال غزل ہے۔ ہم ہر مکمل طور پر ایک نکتے ہیں کہ غزل میں شعور کی رو کی وحدت ہوتی ہے۔

ایک اور طرح سے اس کے پہلے تعارف سے پورا راگ چلتا ہے۔ ایک حافظ حبیب الرحمن کی ایک دھڑکن سے بھری لہجہ اور آہنگ معلوم کر لیتا ہے۔ اس طرح کسی شاعر کے ایک شعر سے صحیح ذوق و ادراک رکھنے والے اس کے لیے بے شعوری کردار کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ غالب نے بڑی کج بات کہی ہے۔

غالب بہ فتور و صلا باشد کلام مرد

باید ز صفت نبض حریفان شناختن ز



غالب کے شعرا کا اگر اس کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے حقائق اور معاملات و مسائل کے بارے میں شاعر کا ایک مستقل فکری میلان ہے جو استفسار و تفتیش کا قیصر ہے۔ غالب کو آفریقہ کا کائنات اور حیات انسانی کے تمام رموز و اسرار کا پورا اور اک حاصل ہے اور وہ ان کو ایک وقت جھکنا بصیرت اور فنی کارادہ سلیقہ کے ساتھ ہلکے نشانوں میں ردیاں کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں تخلیق اور کائنات کے نکات ہیں یا انسانی زندگی کے مسائل یا انسانی کلب و دماغ کے واردات و کجلیات غالب ان کو صورت بیان کر کے نہیں رہ جاتے بلکہ ان پر مستغیر انداز نظر ڈالتا اور غور کرتا سکتا ہے۔

غالب زندگی کے شاعر ہیں اور زندگی کے ہر پہلو اور اس کی ہر سطح کے شاعر ہیں۔ شاعر کی سب سے بڑی ہمنوا یہی ہے کہ وہ چند ترین سطح پر پہنچنے کے بعد بھی انسانی زندگی اور انسانی شعور کا بہت ترین مغزوں کو قبول نہ جلائے بلکہ ان کو ہر حال نظر میں رکھے۔ غالب کے اردو دیوان میں جہاں اس قسم کے حکیمانہ اشعار ملتے ہیں۔

شکوہ و شکوہ شکر نیم و امید کا کچھ  
فلذۃ آگاہی حسد اب دل نہ کچھ بلا کچھ  
یا

نظر میں ہے ہماری جاوہ راہ فنا غالب  
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجڑنے پریشاں کا  
جہاں ایسے مہذب اور لطیف انداز کی معاملہ بندیاں ہیں۔

ابھی آتی ہے بُو بانش سے اس کی زلفِ مشکیں کی  
بنامی دید کو خواب زلیخا عا ربستر ہے  
یا

نہیں اس کی ہے دماغ اس کا ہے واقف اس کی ہیں  
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں  
وہیں اس طرح کے اشعار بھی نظر آتے ہیں جو تربیت یافتہ ذوق کو گواہ کرتے ہیں اور جو اگر غالب کے دیوان میں نہ ہوتے تو وہ غالب سے کبھی مضروب کیے جاسکتے۔

دھوکا بہن جب میں پیچھے کو اس ہم تم کے پاؤ  
رکھتا ہے منہ سے کھینچ کے باہر لگیں کے پاؤ



یا

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں چول گئے

کہا جو اس نے ذرا میرے ہاتھ پاؤں کو

میں شاملیں غرضی کلام میں نہیں ملتیں اور داد و دیہ میں مخالفتیں ہیں لیکن اس کا رد وہی ہے جس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں یعنی غالب نے غزل اور شعور غزل کی کسی سطح کے حالات و تجربات کے نقطہ میں قاصر نہیں تھے۔

کسی شاعر یا دانشور کے فکری نظام کے مسئلے میں سب سے پہلے جو سوال ذہن میں آجھرتا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات تحقیق کا نہایت تحقیق کا سبب اور اس کی غایت کے بارے میں اس کا کیا نقطہ ہے اس لیے کہ بڑے سے بڑا شخص بھی اس سوال پر اجماعی امر خود کرنے کے بعد ہی اپنے الحاد کو مہم چلاتا ہے غالب کا بھی اس باب میں اجماع واضح قصور ہے۔ یہ کہنا چاہیے کہ غالب اپنے عہد کی مخلوق میں تھے اور ایک نئے عہد کے خالق بھی۔ وہ روایت شکنی کو تسلیم ہی کرتے تھے اور اس کی قیمن و تہذیب کے لیے جدت کو ہی ضروری سمجھتے تھے۔ وہ تقلید و اجتہاد دونوں کے یک وقت چائل تھے۔ پہلی صحبت میں غالب کو ایک نابھہ تسلیم کیا باپ کا ہے اور نابھہ اپنے زمانے سے بہت آگے جاتا ہے لیکن وہ اس سے بے تعلقی نہیں رہتا اگر ایسا ہو تو وہ اپنے زمانے کو کوئی نیا پیغام نہیں دے سکتا۔ وہ اپنے زمانے کو انوار و صانع عناصر کو سمیٹ کر آگے بڑھتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے اصلاحات و عمارات میں لوگوں کو مخاطب کر کے اپنا نیا پیغام سناتا ہے۔ اس لیے اس کے غاضب بھی اس کو سمجھتے ہیں۔ غالب ہی مستقبل کے بھرپور سے پہلے اپنے ماحول کی مخلوق تھے اور جہاں تک تحقیق کائنات خالق و خلقت کے رشتہ کا تعلق ہے اس زمانہ کا سب سے زیادہ مقبول رجحان وہ تھا جس کو وحدت الوجود کہتے آئے ہیں۔ مآل سے لے کر اب تک غالب کے جتنے ناقد گزرے ہیں سب نے غالب کو صوفی اور صوفی بتایا ہے۔ خود غالب نے اپنے کو توحید کا ہے اور اپنا ہمیشہ ترکہ و رسوم بتلایا ہے۔ ان کو اپنے مسائل قصوف اور ان کے بیان پر پڑا مانا ہے۔ غرضی اور اردو میں ان کے بہت سے اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں جو غالب کے دعوے اور ناقدین کے خیال کی تائید کرتے ہیں۔ مثلاً :-

اسے کون دیکھ سکتا اگر یگانہ ہے وہ کیا

جو دوئی کی جو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ شعر غالب کے شعور و تری اشعار میں سے ہے اور حتیٰ بار چڑھا اور سنایا باپ کا ہے کہ اگر کوئی اسے فرسودہ کہہ کر نالہ دے تو وہ معاف کیا جاسکتا ہے لیکن غالب کی ایک ممتاز صفت یہ ہے کہ ان کے اشعار کسی فرسودہ نہیں ہو پاتے بلکہ ان کو جب مجھڑے جیسے آپ کو اس میں تازگی محسوس ہوگی۔ اس شعر میں غالب کا نقطہ توحید کے مبہم طور پر بھی الہی ہی



ہوئی کے نظریے سے لیتا ہے۔ غالب نے ایک ہمالیہ کا دورے دو چار ہفتے تک لکھائی دیتا، کو بڑے مغرور انداز میں استعمال کر کے ایک جگہ نہ ٹکریں کیا ہے جو دور اور دو چار کی طرح ایک بڑی حقیقت ہے۔ ایک کو ایک سے ضرب دیتے جانیے وہ اب تک ایک رہے گا۔ وحدت بشری وحدت رہے گی لیکن ایک میں کسراقل کا بھی اضافہ کر کے اس کو اسی سے ضرب دیتے جانیے اس میں قند و جڑ جھانے گا۔ وحدت میں کثرت پیدا ہوتی چلی جائے گا اور نکاح گاہیں مسلسل ختم ہونے لگیں گی۔ دو سے چار اور چار سے سولہ اور سولہ سے دو سو گھپن اور یہ مسلسل ان غیر انہایت جاری رہے گا۔ شعر میں ایک اور نکات ہے۔ غالب صرف ایک ذات کو مرعہ دیکھتے ہیں دوسری کوئی ذات موجود نہیں۔ پھر کون دیکھے اور کس کو دیکھے دیکھنے کے لیے کم سے کم دو ذاتوں کے درمیان کا تسلیم کرنا پڑے گا۔

اس خیال کو غالب نے ایک دوسرے شعر میں بھی ظاہر کیا ہے۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے

جہاں ہیں پھر شاہد ہے کس صلب میں

ایک خارجی شعر میں کہتے ہیں:-

جلوہ و نظارہ پنداری کو از یک گوہراست

خوش را در پردہ خلقے قماش کردہ

یہی تصور ایک اردو قصیدہ کے مشہور مطلع میں زیادہ دلہندہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

وہر جہنم جلوہ یکسانی معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر خوش نہ ہوتا خود میں

لیکچر شمار اور اسی قبیل کے سُن لیے مجھے جو وحدت الوجود ہی کے نظریے کے حامل ہیں:-

دل ہر قطرہ ہے سازِ آسمانِ بھر

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ہے کائنات کو حرکت تیری ذات سے

پتہ تو ہے آفتاب کے نور میں جان ہے



ہے جہتی تری سائن وجود  
ذوہ ہے پر تو خود شید نہیں

عالم از ذات جدا نمود و نمود جز ذات  
پہر دانے کہ بود در دل مسند زانہ نہیں  
شہزی آبر گہرا گئے وہاں شد اسی عنوان کے تصور وحدت کا اظہار کرتے ہیں جی کو ہم اکابر مسک وحدت  
الوجود سے منسوب کرتے آئے ہیں۔

جہاں چھیت آئینہ آگس  
فضائے نظر گاہ و حسبہ الہی  
ہر شو کہ رو آوری سوئے اوست  
خود آں رو کہ آوردہ رشتے اوست  
چوں این جہاں را گفت عالم اوست  
بجفت آنچه ہرگز نہ آید ہم اوست  
اور یہ شعر بھی بڑا لطیف اور کیف آگس ہے۔

سچہ وہی بدستی بر ذوق کا خود غور خواہ

جس کے جلوے سے زمین تا آسمان ترش ہے

لیکن غالب اپنے طبعی تامل اور استفسار کو کیا کریں۔ وہ ان چتے لوگوں میں سے تھے جن کے دلوں میں کسی نقطہ نظر  
کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی شکوک و سوالات رہ رہ کر ابھرتے رہتے ہیں اور جو کبھی اپنے فطری میلان آفتیش و تھنوں کے ساتھ  
نا انسانی نہیں کر سکتے۔ غالب وحدت الوجود کے نظریہ کو قبول کر چکے ہیں۔ وہ حسد کو ملامت اور خدا سے گلہ تسلیم نہیں  
کرتے۔ لیکن اس کے باوجود وہ حیرت کے عالم میں کھاتے ہیں۔  
ہر چہ ہر یک شے میں تو ہے

ہر چہ ہی تو کوئی شے نہیں ہے

یا سوال کرنے لگتے ہیں۔



جب کہ تمہیں نہیں کوئی موجود  
 پھر یہ ہنگامہ اسے خدا کیا ہے  
 یہ پری چسورہ لوگ کیسے ہیں  
 غنہ و عشوہ و ادا کیا ہے  
 مشکین زلفِ حنبری کیوں ہے  
 نگو چشمِ سرور کیا ہے  
 لادو گل کہاں سے آئے ہیں  
 ابر کیا چسپہ ہے ہوا کیا ہے

حالانکہ وہ تسلیم کر چکے ہیں کہ :-

سے رنگ لادو گل و نسریں جدا جدا  
 ہر رنگ میں ہمارا کاشیات چپا ہے

اور یہ بھی تعین کر چکے ہیں کہ

پہنچے بہ حسبِ گردشِ پانچ صفات

عارف ہمیشہ مست مئے ذات چلائے

مرزا بیدل کا مجوز ہی مسک ہے۔ مجاز کو حقیقت تک پہنچنے کے لیے جی تباہ کیا۔ مگر حقیقت کا کوئی دہریہ  
 تو اس تک پہنچنے کے ذریعے کے وجود کو بھی اصل تسلیم کرنا پڑے گا۔ پھر صفات و مظاہر میں یہ شکوک و سوالات کیسے ۹۔  
 مرزا بیدل اسی لیے بھاگتے ہیں۔

نفوسِ اعتبار و دشمن و دوست

سوادِ نفسِ یکیت ان دوست

اور پھر غالب ہیں ملک اور سوال کی منزل پر نہیں ٹھہرتے بلکہ آگے بڑھ کر اثبات اور تعین کی ایک میں دہریہ  
 منزل پر پہنچ جاتے ہیں جو منزل و دستِ اوچر و کائناتِ معلوم ہوتی ہے۔ وہ خالق اور خلق، اللہ اور غیر اللہ، ذات اور صفات  
 نظام کو شریکِ انزل اور دونوں کو یکساں برحق مانتے جیسے ہستی کو قرب اور تمام عالم کو خلق و امثال بتاتے ہیں۔ یہ  
 کیا ہے ۹ وہ تسلیم کر چکے ہیں کہ :-



دہر جسز جلوہ یخت فی معشوق نہیں  
 ہم کہاں جوتے اگر حسن نہ ہوتا خود میں  
 پھر بھی وہ ماسوا کو تو ہم ترادیتے ہیں۔ کہتے ہیں  
 اسے نہ ہم غیر عرفا درجساں انداخت  
 گفتہ خود حرفے و خود را درگساں انداخت  
 یا یہ شعر جس کی بلاغت کا احزان غائب کا مخالف بھی کرے گا۔  
 نہ جو پہ ہرزہ بیاباں نورد و مسیم و جود  
 ہنوز تیرے قصور میں ہے نسیب و فزار  
 اگر بت اور امر بت بر جتی ہیں تو امر بت سے بڑا عالم موجودات خود میں آیا وہ تو ہم نالگائی کیسے برکتا ہے۔  
 ہوا بھی یہ دہائی کر چکا ہے کہ  
 قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا یکن  
 ہم کو منظور تنگ خسرو فی منظور نہیں  
 وہ دوسری ہی سانس میں یہ کیسے کر سکتا ہے کہ۔  
 کہتے ہیں شاید مطلق کی کر ہے عالم  
 لوگ کہتے ہیں بڑے بڑے ہیں منظور نہیں  
 اس قبیل کا ایک دوسرا شعر ہے  
 ان کھانہ موت مسترب ہستی  
 ہر چند کہیں کو ہے نہ نہیں ہے  
 غائب اس منزل پر بھی قیام نہیں کرتے۔ وہ عالم صواب و معرکہ صرف وہی کہہ کر مطمئن نہیں ہوتے۔ ان کو ملتی  
 ہستی پہ تضاد معلوم ہوتی ہے جنکو میں فساد و فنا تخلیق میں زوال اور موت کے میقاتات موجود ہیں۔ ہستی کی خلوت میں  
 نیستی ہے غائب شناسوں میں یہ شعر مشہور ہے جو صرف ایک حد پر تصور کی ایک بائبل تفسیر انداز میں ترجمانی کرتا ہے بلکہ  
 اس جدلیت کی طرف جارتہ ذہن کو منتقل کرتا ہے جو عام حور سے میل اور راکس کے ساتھ فسوب کی جاتی رہی ہے۔



مری تحریر میں مضمر ہے کہ صورت خرابی کی

بیماری برقی غریب کا ہے خون گرم دہشت کا

اُردو میں تعاقبی حقیقت کا آغاز میں تو حال، بھیل اور ادا دار امام آخری کے تصور سے جو گیا تھا میں اپنے زمانہ کی  
نوجوان نسل میں اس میلان کو استوار اور رائج کرنے والے ڈاکٹر عبد الرحیم بھڑی ہیں جنہوں نے اپنے اجتماعی مضمری  
تھامس کلام نقائب میں دنیا کا کشیدہ ہی کوئی چھوٹا سا رنگ دیا ہے جس سے غائب کا شبہ نہ کرنا ادا ہو جس کے قول کا حال نہ  
دیا گیا ہو یہ غائب کے ساتھ غلو کا رنگ ہے جو نئی حقیقت کا تجویز ہے۔ پھر بھی بہانہ تسلیم کریں گے کہ بھڑی کو اس کا حق  
تھا۔ اسی کو کئی زبانوں پر قدرت حاصل تھی اور وہی اس کا مطالعہ غیر معمولی مدد دیتا اور حقیقت تھا اس لیے غائب کے مسئلے میں  
ان کو دنیا کے دوسرے قدیم ادیب جدید انکار کے غریب اجتماعات اور نئی اختراعات یاد آتے گئے تو کوئی قابل گرفت بات نہیں  
خود مجھے غائب کا نہ درج بالا شروع جب جب یاد آتا ہے تو زمانہ قبل سقوط کے زمانہ حکیم ہرقل ہوس کے نظریہ حدوث سے لے کر  
پیش اور مارکس کے جدلیات اور یہ کہیں کے تخلیق اور قضا تک کی سرسری یاد آتی رہی ہے۔ مگر یادوں کی اس رومیں بہہ جانا  
نیک نہیں۔ اس سے اصل موضوع کا سرسریہ ہاتھ سے جا آ رہا ہے اور فیصلی جیج شہید چنداں کہ جانے میں گم شدہ وال بات  
برہا آتی ہے۔

جس شعر کے مسئلے میں میں نے اتنی طوالت سے کام لیا اس پر اگر غائر نظر ڈالی جائے تو یہ احساس ہوتے بغیر نہیں  
رہ سکتا کہ میں حدود غیر حادثہ "CHANGELESS CHANGE" کو غائب ہیں کی غلطی اور ناگزیر خصوصیت تسلیم  
کرتے ہیں اس کیفیت بالخصوص انسان کے حقی میں کوئی مبالغہ بات نہیں سمجھتے۔ البتہ سے صاف چنگتا ہے کہ ان کے دل میں  
دی مضمر ہے جس کا کھل کر دوسرے شاعر غریبوں انکار کیا ہے۔

اس سے بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا

اور غائب کے اس زبان نہ تو میں دوام شعر کو کیا بھی جانتے جو قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید اور دور دوری ان  
غائب کے ہر نسخہ میں ہم انداز کا حکم رکھتا ہے۔

نقش فرما دی ہے کس کی شوقی قریر کا

کاغذی ہے پیر میں ہر سیکر قصیر کا

غائب خود اس شعر کا مطلب سمجھ گئے ہیں اور ہمارے لیے مذہب یا کسی نئی تادیل کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔  
ہر نقش نقاش سے فریاد کر رہا ہے کہ اُس نے اس کو نیکار و جدوی انہیوں میں مبتلا کر کے کیوں چھوڑ دیا ہے۔ ایسا معلوم





ہوتا ہے کہ نقاش صرف اپنے شوقی تحریر کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور میں نقاش کو اب اس سے سروکار نہیں کو نقاش پر کیا گزرد ہی ہے کائنات کا ذرہ ذرہ اور کراہ کراہ کا آفریں گار سے شکایت کر رہا ہے کہ اس نے اس کو ہستی کی کرہنگ کو نقاشوں میں مجبور اور مجس کر کے ایسی بے پروائی اور غفلت شعاری کیوں اختیار کر لی ہے۔ غالب کو کارگاہ ہستی کا ہر لہذا رخ سلمان نظر آتا ہے اس شعر میں غالب انگریزی کے اس شاعر سے مختلف نہیں معلوم ہوتے جو کہ گویا ہے :

( ON THE CREATION OF THE BEAUTY HANGS THE HIST OF TEARS )

صبر سے حسن کی کائنات پر آنسوؤں کا گہرا چھایا ہوا ہے :

گویا غالب مغرب کی بعض عظیم منظموں اور ادیبوں مثلاً شو بہلہ دیو پادوی، نووالس ملامس ہارڈی وغیرہ کی طرح تخلیق اور عالم ہست و بود کو ایک ایسی قوت کا نازل کیا ہوا غلاب سمجھتے ہیں جس نے سوچے سمجھے بغیر صرف اپنی قدرت کا نشانہ دکھانے کے لیے اتنا ہزار عالم کو پیدا کر کے پیمانہ اضطراب میں پھینک دیا۔ یا مادہ تراور کا سیر کی طرح وہ آفرینش کو کسی لامتناہی قوت کی بے مقصد اور بے مصلحت حرکت کا اضطرابی نتیجہ تصور کرتے ہیں جس کو انساں معقول اور بامقصد بنانے کی پیہم جہد و جدوجہد محنت و کاوش میں مبتلا ہے یا کیا وہ خرافاتی حمد کے پناہیوں کی طرح اس توہم کے عکاس ہیں کہ جو تمام کو پیدا کرتے ہیں اور ہم جس طرح کھیل میں مشربا ونا کھیتے کھیلوں کو مارتے ہیں اس طرح یہ دینا اپنی تفریح اور کاشے کے لیے قسم قسم کی لذتوں میں گرفتار کر کے آخر کار ہم کو فنا کر دیتے ہیں۔

غالب کے اصل اندکی میلان اور ان کے مزاج کے باب میں ان میں سے کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ بتایا جاتا چکا ہے کہ غالب نے منتظر میں سے لے کر خود ان کے عصر تک جتنے اکابر و مفکرین گذرے ہیں بالخصوص فارسی اور اردو میں ان سب کے حالات کا احترام کیا ہے اور اپنے مزاج اور اپنے فطرت کے مطابق کم و بیش سب سے اخراجات قبول کیے ہیں اور مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایسے مکوں اور ایسی زبانوں کے قدیم سے قدیم سے جدید مفکروں اور فنکاروں کے تصورات و تاثرات کے ارتقادات ہیں ان کے اردو اور فارسی منظومات و شہوات میں پائے جاتے ہیں جن کا علم ان کے بعد کی نسلیں کو تو بتدریج ہوتا گیا لیکن جن سے خود وہ براہ راست یا بالواسطہ عقلی ناواقف اور غیر متعارف تھے۔ اور کوئی حیرت کی بات نہیں حقیقت جو حسن اور حیرت کو اپنا اندر کیٹھتے ہوتے ہے کسی ایک ملک یا کسی ایک زبان یا کسی ایک قوم کا اہارہ نہیں ہے اور نہ وہ کسی خاص تمدن یا دور کی بدولت شریعت سے جاگیر ہے۔ ایک ہی تمدن یا دور کے مختلف افراد کو مختلف ملکوں مختلف زبانوں اور مختلف زمانوں کے مختلف افراد کو ایک ہی حقیقت کی ایک ہی قسم کی جھلکیاں محسوس ہو سکتی ہیں بشرطیکہ وہ صاحب فکر و نظر ہوں۔



نائب اپنے منصب ٹکریں ہانکے سفر کرتے۔ ان کا فلسفہ کونیات (COSMOLOGY) یا نظریہ وجود و پست (ONTOLOGY) قدما اور خردوان کے سامعین اور محققین کے بعض ماہرین فہمی ایشیا اور ناقلیقین دانش و حکمت کے ارتکابات و افکار سے قریب یادوں کی مشابہت دیکھتے ہوئے بھی سب سے مختلف ہے۔ نائب اس وحدت کے قائل تھے جو خرافیت اور دشائیت یعنی فلسفہ افلاطون اور فلسفہ ارسطو کے استخراج کا نتیجہ تھی اور جس کا بانی یونان کا مشہور حکیم فلاطون تھا اور جس کو پھر رواقیوں کے ساتھ کم و بیش دنیائے اسلام کے مدارس نے جیسے علما اور مشائخ نے اختیار کیا اور اس کو سفر فرخ دید۔

نائب ایک ذات واحد ایک مہستی مطلق کو کہتے تھے جو ہر اقل اور ہر اکثر ہے۔ جو ساری کائنات کی روشن ہے جو علت و معلول بھی ہے اور غایت انتہیات بھی۔ نائب بار بار امرار کے ساتھ دہرائی کرتے ہیں کہ وہ موجود ہیں۔ وہ موصوفی تھے حکیم تھے شاعر تھے۔ وہ عارف تھے۔ اور انسان اور انسانیت کی بھی معرفت بھی ان کو حاصل تھی جو اس لیے دنیا و شکل ہے کہ اس کے لیے انسان کی عظمت شناسی اور اس کے ساتھ قلبی ہمدردی درکار ہے۔

خانی اور خلق ذات اعلیٰ اور عالم مظاہر کے باب میں نائب کی فکر و نظر کی تین سطہیں اور تین زاویے تھے۔ نائب کا اساسی عقیدہ وحدت ہے۔ جو قول خود وہ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتے تھے اور دل میں لاہو جو لا الہ الا اللہ کو شہرئی اور جو لا الہ الا اللہ کہتے تھے۔ لیکن یہ وحدت خود ازل سے اپنے اندر کثرت لیے چھوئے ہے جس کے بغیر وہ اپنے کو ظہور میں نہیں لاسکتے۔ ذات اور اس کے صفات و مظاہر و جوہر اور ملکات و قدم اور حوادث کو ہمہ غزوات کی حیثیت رکھتے ہیں اور دونوں حقیقی ہیں۔ لیکن کثرت صفات و مظاہر و کثرت حوادث صرف غزوات میں ہر لازم سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتے۔ چنانچہ انیس یا کس کوئی حقیقتیں ہیں لیکن ذات لازم سے جدا ہو کر ان کا کوئی وجود نہیں جس باجمہر ناقص لیکن ناممکن و متصور کو کہنا اور اس طرح الفاظ کا بامہر پھینا کر دوسرے بھی کہہ سکیں آسان کام نہیں۔

نائب ساری کائنات میں ایک روح کا دریا پاتے ہیں۔ ان کو تمام مظاہر و حوادث کے بعد میں ایک تہمت (IDENTITY) محسوس ہوتی ہے۔ ایک شعر میں ہے: اعترافی کے مشہور شاعر حضرت درویشی کے کہ یاد آتا ہے وہی ایک بات ہے جو ہاں نفس و ان شکست لگی ہے

بچیں کا جلوہ باعش ہے مری زنجیں توانی کا

اس وحدت اس کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کو شاعر نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں جا بجا نئے نئے ہر لہجے میں کہنے کی کوشش کی ہے جس میں سے ہم اس صحبت میں سناچہ کاموں لیکن نائب نے جس جس انداز سے



اس چسپید و قسرت کو اپنی خدای شمری آبرنگر باتیں واضح کرنے کی کوشش کی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ شمری نامکس ہر تہ  
ہوئے خاص طرح سے اور طویل اور نامکس ہونے کے باوجود شاہکار ہے۔ یہ کچھ منتخب شدہ ہی پیش کرنا اس وقت ممکن  
اور مناسب ہے۔

چہ چسپیدا تو باشن نہاں ہم توئی  
اگر پردہ ہا شد آن ہم توئی  
چہ ہا شد چنین پردہ عاسافتن  
مشکلفے بہ ہر پردہ انداختن  
ہر ہی روئے روشن نقاب از چہ رو  
چہ کس جہت تو خبرد عجاب از چہ رو  
ہانا ازاں جا کہ توحیق ذات  
بودند و ہرست حسن صفات  
تعاظمت فرہن ردائی و دوست  
ظہر شعیون خدائی و دوست  
پہرہاں شعیون کی تفصیل ہے جن میں یہ جمال و جلالت اپنے کو ظاہر کرتا ہے۔  
بہ گردوں زہر وہ بہ اختہ ز تاب  
بہ دریا ز موج وہ بہ گہر ز آب  
بہ انسان ز نطق وہ بہ مرغ از غروش  
بہ نندان ز وہم وہ بہ دانا ز ہر شش  
بہ چشم از نگاہ وہ بہ آہو ز رم  
بہ چنگ از فرستہ وہ بہ مطب ز دم  
بہ باغ از بہار وہ بہ شاہ از نگیس  
بہ گیسو ز بیچ وہ بہ ابرو ز ہمیں



عباد وجود آشکارا کنی  
نشان دہتے جو آشکارا کنی  
یہاں شاعر کی فکر روپر مرکبات ملتیں ہیں اور وہ بے اختیار کہہ اٹھا ہے  
چہ باشد چہ نہیں عالم آرا ہے  
ہانا نیا سے و تنہا ہے

حسّ ازل اپنی اس حیثیت اور احدیت کے احساس سے جب کہتا ہے تو اپنی خلاق قوت کو کام میں لاتا ہے اور اس عالم کو پیدا کرتا ہے نہ صرف اس لیے کہ دوسرے اس کو دیکھیں بلکہ اس لیے کہ وہ خود بھی اپنے کو دیکھ سکے جس ازل خود میں و خود ناکم تو ہے۔

غالب اس نظر عالم کو ایک ایسی قوت سمجھتے ہیں جو سائر کائنات کے لیے سراپا جود و کرم ہے اور تمام مخلوقات کی نفع و بہرہ و برکت اس کے پیش نظر ہے اس لیے اس نے دکھ سے پہلے دکھ کی دوا پیدا کی۔

چارہ درنگ و گیاہ و درو با جاں دار بود

پیش ازل نہیں دردد آں را مہیا کردہ

اس منزل پر پہنچ کر شاعر چاہتا ہے اور اس کا شعور دوسری سطح پر آجاتا ہے اور دوسرے زاویے سے حقیقت اور جہاز سن اور صورت ذات اور عکس ذات کے مسئلہ پر غور کرنے لگتا ہے۔ اس کے دل میں اندیشہ پیدا ہوتا ہے اور پوچھتا ہے اس کو پریشان کرنے لگتا ہے۔ کیا ہم انسان تمام تر بیت اور معنی و دریافت کے بعد بھی تکمیل اور فکر کی اس سطح پر پہنچ سکتے ہیں کہ وہ "شہود و شاہد و مشہود یا غور و غور و غور کو ایک جگہ سکھیں اور ہر حجاب کو تار کا پردہ تسلیم کریں جس کے بغیر تو اپنے راز کا صورت پر کن محالات ہے۔ اور شاعر کا دل گواہی دیتا ہے کہ اس نکتہ تک پہنچنا عام انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں۔ چرچہ و گلزیدہ کا بڑی شخص اشتراکیت (PERSONAL ILLUMINISM) حق خدا کے کیا کام آسکتی ہے۔

غالب بار بار ہمارے ذہنی نشین کرتے ہیں کہ۔

قطرے میں دجلہ و کھان زوے اور جزو میں کل

کھیل لڑکوں کا چہرہ دیدہ ہمیں نہ ہوا



یا

حضرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہر جان  
درد کا حصہ ہے گزرنا ہے دوا ہر جان

یا

قطرہ دنیا میں جوں جوں جلتے تو دنیا ہر جلتے  
کام اچھا ہے وہ جس کا کرناں اچھا ہے

لیکن خوب معلوم ہے کہ یہ منزل اور اعلیٰ ہستی کے دائرہ سے باہر ہے اور خواہاں بھی جو اس منزل تک پہنچنے کی طاقت رکھتے ہیں یہاں مستقل قیام نہیں کر سکتے۔ ان کو دنیا کے گود باد میں واپس آنا پڑتا ہے جو ان کا فطرۃ اور اصل مقام ہے۔

اب غالب کو وہ سرِ مخروطِ محسوس پر نہ آسکتے کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ مجاز کو اصل حقیقت اور عکس ذات کو عین ذات سمجھ لیں اور صورت پرستی میں مبتلا ہو جائیں۔ اسی لیے کہ وہ عالمِ گرام مقدس میں خلیق تصور کرتے ہیں اور اس کو خواب میں بھی دیکھنے سے بڑا ہاتھ دھکتے ہیں۔ لیکن اشعار اس سلسلے میں یاد گار ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ دنیا کی بے ثباتی اور ناچائے داری کا سبق دیتے ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ شاعر کی دیکھ بھولنے ہیں۔

باز بچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے  
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے  
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور  
حبسِ دہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ہرگز ہے فقرِ فریبِ ہستی و عدم  
فقر ہے آئینہ منسرقِ جنوں و تمکین  
لافتِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم  
قدید یک جا فرقت ہے چہ دنیا چہ دیں  
قبلِ مضروب و دستِ یادِ بدستِ تسلیم  
صورتِ نقشبِ قدیم خاک بہ منسرقِ تمکین



اور ایک مشہور فارسی غزل کے یہ اشعار :

دود و سودائے عشق بیت آسماں ناسید مش

دید و خواب پریشاں زد جہاں ناسید مش

وہم خاک کے ریخت و چشم بیا بیاں دید مش

قطرۂ جگر اخت بحر سیکر ان ناسید مش

لیکن یہ غائب کے دل کی آواز نہیں معلوم ہوتی اور اس غزل کے اشعار اسی کے فارسی اور اردو کلام میں  
سودہ سے چند لگتے ہیں ۔

ایک بار غائب ہر شیا دہستے ہیں بارہ تیریں اور آخری سطر پر اگر تیسرے زاویہ سے جتنی پر غور کرتے ہیں ۔ یہ  
سطح ان کی فکر کا مستقر ان میں ہے ۔ ان کی اصل تمدنی سطح پر نمایاں ہوتی ہے اور ان کی فکر و فکر کی کائناتی اور ان کی شاعری  
کی بڑی اسی مقام سے ہے ۔

غائب کی باخلاق و ادراکے کائنات کی سطح سے غور کرنے کے بعد یہ محسوس کرتے ہیں کہ شاعر کی اصل دنیا  
نیک ناک مشرق کی زنگی دنیا میں ہے بلکہ وہ مشرق اپنے مظاہر و حوادث کی زیر نگین کی دنیا ہے ۔ انسان اور ایک انسان  
ہونے کی حیثیت سے شاعر کو اسطر فوق یا مہجرت سے ہے جو سر تا سر عالم قوانیت ہے ۔ اس عالم سے باہر کسی پر  
تو کر سکتا ہے گرد و پاں مستقل قیام نہیں کر سکتا ۔ عالم فوق یا عالم مہجرت میں ہر مخلوق اپنے انفرادی وجود کے زاویہ سے  
تطالع ہستی کو دیکھتا ہے اور اپنی فرویت کی جدا گانہ حقیقت کو تسلیم کیے جانے کا مطالبہ کرتا ہے ۔ کل کا وجود مسلم ۔ جسکی اجزا  
کی الگ الگ حقیقت کو تسلیم کیے بغیر کل کا وجود محض واحد ہر گا اور ہر جزو کی فرویت کی ضمانت کے بغیر کل کی غیرت محلات  
سے ہے ۔

ہستی میں حیثیت الکل مرا یا جزو برکت اسی لگتی ہے جب ایک ایک فرد میں حیثیت الفرد اپنے وجود پر نظر ڈالنا  
ہے تو وہ ناگزیر طور پر فساد و فحاش کی طرف رواں معلوم ہوتا ہے ۔ اور زندگی اپنی فطرت ہی سے المیہ نظر آتی ہے ۔ یہ احساس  
انسان میں کرب کی ایک شدید پہچان ہے اس لیے کہ انسان میں شعور و ہنجاریں ایک پہنچ چکا ہے ۔ شعور کی شدت  
انسان کا سب سے بڑا امتیاز ہے مگر یہی اس کی سب سے بڑی بے نصیبی ہے ۔ نہ انسان کے نظام کائنات ہمیشہ سے ہے اور  
ہمیشہ ہے گا گروہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ ہستی کے اجزا جزوی حیثیت سے ٹٹے رہتے ہیں زنجیر ہشیاری رہتی ہے مگر راج  
کے افراد فنا ہوتے رہتے ہیں ۔ اکثر بڑی کے مشہور روزگار شاعر اردو میں اس کے دل میں یہی غرض تھی کہ جب اس نے اپنے



شاہ کا مرثیہ ”بیادگار“ (IN MEMORIAM) میں یہ سوال کیا۔

”کیا خدا اور قدرت برسرِ بیکار ہیں

کہ قدرت ایسے قاصدِ غراب دکھائی ہے

وہ (قدرت) نوح کی کشتیِ حفاظت کرتی ہے

دیکھیں ہر فردِ صمد کی زندگی کی طرف سے کتنی ہے پرواہ ہے“

اور اب غائب کی طرف آئیے۔ وہ بھی جب افراد کی قدیم قیامت پر غور کرتے ہیں تو ان کو سارا انعام بہت ہی ایک شخص

لامِ اعتدالِ مرگ و نیستی کا کیل معلوم ہوتا ہے اور ان کی زبان سے ہے اقتدارِ نکل جاتا ہے

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تھریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصور کا

اس تاثر کو زیادہ عام فہم زبان میں پھریں بیان کرتے ہیں۔

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا

اُڑنے سے پیشتر بھی مرادِ نگاہِ زندہ تھا

اور اسی شعور کے تحت وہ سوال کرتے ہیں اور یہ سوال ہی اپنا جواب بھی ہے

وہ خود قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا

پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

انسان کے لیے یہ بڑا کرب ناک احساس ہے۔ غائبِ نظرِ ثنائی کے منظرِ حقے وہ بہت ہی کے اس الیہ کی جیکبہ تیر

کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مری تیسری میں مضمیر ہے اک صورتِ حسنہ بلی کی

ہوئی برقِ خرمن کا ہے عُنْ گرم دھچکاں کا

غائب آفرینش اور آفریدگار کی حقیقت سے کچھ طرح آگاہ ہیں۔ وہ عالم اور اورائے عالم دونوں کے عارف

ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنی فکر و نظر کو خیریت انسان اور انسانیت کے لیے وقف کیے ہوئے ہیں۔ وہ انسانی آئینہ و رُسنق

نظرت کے رموز و مسائل کے شاعر ہیں۔ ان کا پیغام انسانیت ہے۔ وہ آدمی مرنا اور آدمی دُعا سکھاتے ہیں۔ وہ ہم کو

آگاہ کرتے ہیں کہ آدمی کا انسان بننا آسان نہیں ہے لیکن اگر آدمی انسان ہو جائے تو یہ اس کا بہت بڑا انکسار ہو گا۔



غالب و حکومت و لاجپت میں مخرج تھے انہوں نے کبھی فوق البشر کا خواب دیکھا۔ انہوں نے صرف انسان پر غور کیا جو شعور کا مکمل نمونہ ہے۔ یہیں شعور انسان کا اعلیٰ ہے اور یہیں اس کی خیر و برکت اور اس کی نجات کا ضامن بھی۔ غالب کو شاید یہ احساس ہے کہ انسان ایک مجبور اور بے بس مخلوق ہے جس کو اپنے آغاز و انجام پر کوئی اختیار نہیں اس لیے میں اور بے چارگی کی بھی کوئی انتہا ہے۔

رُود میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھتے تھے

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے دکاب میں

یہ مجبوری اور روانہ گی انسان کی ہرزاد ہے۔ ایک جگہ استعارے میں غالب نے جڑے و لٹیشی نڈاز سے اس صورت حال کو بیان کیا ہے۔

پہنایا تھا دامِ سخت قریب آشیانے کے

اڑنے نہ پاتے تھے کہ گرفتِ رہم ہوئے

ایک دوسرا شعر ذرا دوسرے رخ سے اسی احساسِ مجبوری کی ترجمانی کرتا ہے اور استعارہ اگرچہ نیا جی ہے لیکن شاعر نے اس میں برقی و نوح چھوٹی ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔

مثال یہ مری کہ کشش کی ہے کہ مرغِ امیر

کرے قفس میں فسنا رہم غمِ آشیانہ کے لیے

زندگی کے ہر میدان میں انسانی کو قدم قدم پر مجبوریوں کا سانہ لگنا پڑتا ہے۔ غالب ایک شعر میں کسی قصہ طائر کے ساتھ ہم کو احساس دلاتے ہیں۔

مجبوری وہ دوائے گرفتِ تاریکی الفت

دستِ تہِ سنگِ آمد و پیمانِ وفا ہے

لیکن غالب ہم کو قنوطیت کا درس نہیں دیتے۔ ہم مغلوب و مجبور ہوں لیکن مغلوبیت غفلتِ انسانی کے ناموس پر ایک بد خدا داغ ہو گا۔ ہماری آرزو میں پوری نہیں ہوتی۔ ہماری امیدیں ٹوٹتی رہتی ہیں لیکن اس سے حدودِ زندگی اور فضولِ کام کی نہیں ہوتی چاہئے۔ ٹھیک ہے۔ مرنے والا مقتدر ہے۔ مگر مرنے سے پہلے سر پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا نامردی ہے۔ ہم کو شکست پر شکست پر قابو پانے کے لیے جدوجہد کرتے رہنا ہے اور چرگِ موت ناگزیر ہے اس لیے ادھیڑ و زلہ و اٹھام کے ساتھ ہم کو اپنے قصہ پر فتح پانے کے لیے حوصلہ اور محنت کے ساتھ کوشاں رہنا ہے۔





ہوس کو بے نشاؤ کار کھیا کیا

نہ ہو مرنا تو بیٹھنے کا مزا کیا

انسان کا خلق منصب یہ ہے کہ وہ اپنی تمام محرومیوں اور بے بسیوں کے درمیان اپنے سینہ کو آرزو سے آباد رکھے اور اس کی طرح کو کسی حال میں بھی نہ ہونے دے۔ یہ بھی اس کے مقصد ہی کا ایک جزو ہے اور وہ طبعی اور طبیعی طور پر اس کے لیے مجبور ہے۔ اگر انسان اس طرح اپنے کو سنبھالے نہ دے تو اس کے سامنے خود کشی کے سوا کوئی راستہ نہیں۔

ذلائی شوخی از شیر تاب درج ز میوی

کھنکھانے والی غنچہ سے

یا اس شعر پر غور کیجئے اگر یہ غائب ہی کا شعر ہے

روانی کی نہ وہی تقدیر نے مقصد کو منظور

بہم رہنے لگے دونوں تفتا اور بھجوری

اس لیے غائب ہم کو یہ تعلیم دیتے ہیں :-

نفس ناخمن آرزو سے باہر کھینچ

اگر شراب نہیں انتظار ساقی کھینچ

دوسرے استعاروں میں فطرت انسانی کے اس راز کو یوں بھجایا ہے

بلا سے ہیں جو پیش نظر درد و دیوار

نگاہ شوق کو ہیں بال و پر درد و دیوار

ایک شعر کو پچھلی سنا چکا ہوں پھر سنیں گے اور اس کے معنی رستہ پر غور کیجئے۔ وہ غزل جس کا یہ ایک شعر ضایعہ دار ہے نسخہ تجدید میں ہے۔

شکوہ دشکر کو شربیم و امید کا بھج

غافل آگے خواب دل نہ بھج بلا بھج

انسان کو جن خصوصیات نے اشرف المخلوقات بنایا ہے وہی اس کے لیے اتنا دھمکی بھری ہوئی اور ان خصوصیات میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صاحب دل ہے اور جہازِ دل بھی دل رکھتے ہیں لیکن ان کا دل صرف محض گوشت ہے۔ انسان کا دل ایک ناقابلِ تہیز توانی ہے اور اس دل کی بدلت و تبدلت کے عناصر و



منہا ہر کو سحرنا چلا آیا ہے۔ جب تک اس کے سینے میں بدل ہے وہ بیم ورجا کی کشش میں مبتلا رہے گا یعنی اس نال کا درد آرام ملا ہے جو لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے یا اس سے روگردانی کرتے ہیں ان کو غائب، خاڑا آگس خراب، تصور کرتے ہیں۔ تیسری کا بھی ایک شعر ہے جو ان کے اپنے مزاج اور انداز بیان کی چھپ لیے ہوتے ہے۔

بیزول ہر نقش و نگار بے سزا ست

ہیں بدق کر یہ گشت دعا میں جلت

غائب نامیدی کو انسان کے حق میں ایک ممکنہ خطہ سمجھتے ہیں اور اس سے پناہ مانگتے ہیں۔ نامیدی یعنی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کی ایک مشہور مثال کا ایک شعر ہے جو ٹکڑوں کے معجزات میں سے ہے

ہیں جہنم نامیدی خاک میں مل جائے گی

یہ جو اک لذت ہماری سس بے حاصل میں ہے

آدمی کا فطری منصب لذت و کاوش اور سعی و پیکار ہے اور سعی و پیکار خود اپنی جگہ ایک مقصد اور ایک قدر ہے۔ اس لیے اس کے باطن میں رہا ہے حاصل ہونے کا اور اصل سوال نہیں تھا۔ اگر آرزو کا انجام شکست آرزو ہے تو شکست آرزو ہی ہماری آرزو بھی ہے۔ آرزو نے ہم پر یہی ہماری زندگی میں کیف و لذت کا سبب ہے۔

طبع ہے خلاق لذت مانے مرث کیا کروں

آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے

اسی قبیل کا ایک اور شعر یاد آگیا۔

عشرت پارۂ دل ز غم تفت کدنا

لذت ریش جگر خرق لنگ داں ہونا

ہزار آسودہ گریں اور نا آسودہ گریں کے بعد بھی تفت انسان کی طبیعت کو چہی نہیں بیٹھتی۔ اس نکتہ کو کتنی دلچسپی کے ساتھ اس شعر میں بیان کیا گیا ہے۔

خبروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش ہے دم نکلے

ہست نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

آرزو منہی ایک ادنیٰ وجہ کو کہاں سے کہاں پہنچا سکتی ہے۔ اس کو غائب کی زبان میں کہتے ہیں۔



شوق ہے ساماں طراز نازش ارباب بکر

قدہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آتش

وہ انسان کی اس حقیقت کو سمجھنے اور سمجھ کر اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے بڑے جنگی مزوت ہے  
غالب میں ہی بکر وادی کی تلقین کرتے ہیں اور اس کے لیے مرد ہونے کی مزوت ہے۔ غالب کے کاوڑہ میں آدمیت  
کی پہچان مرداٹھی ہے۔ زندگی ایک مہازدہ ہے جس سے مردی جلد یا بچر سکتا ہے۔

دھمکی میں مر گیا جو نہ اب بند تھا

عشق نیرو پیشہ طلب گار مرد تھا

اور مرد کی پہچان کیا ہے۔ غالب نے اپنی پہلی غلامی مضمون پر مرموز پیشہ میں انہی کی طرف بڑے طبع  
اشعار کیے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مثنوی میں مرد کے سارے خصوصیات بہادر شاہ ظفر میں مرکوز دکھائی گئی ہیں بلکہ بدقت  
اور حالات کا تقاضا تھا۔ مرد کی تعریف میں جو چند اشعار کے گئے ہیں وہ مثنوی کی جہاں ہیں اور کلیات کا حکم رکھتے ہیں۔  
مرد کی تعریف پیشہ رہی۔ یہ سچ ہے کہ جہاں اشعار میں کی گئی ہے۔

گردن دل در پیش از دستی طواف

بکلیں سے از تنہی بود پشونگاف

اسے کہ از دلاز نہاں آگسہ زہ

دم مزین از رہ کہ مرد رہ نہ

مرد رہ باید کہ باشد مرد عشق

لب ترخم خیزو در دل درو عشق

میراد دل ہے کہ انسانی تہذیب کی تاریخ کے کسی دور میں کوئی ملک کوئی قوم مرد کا اس سے رفیع تر تصور  
نہیں پیش کر سکی ہے اور آج بھی مرد کا اس سے زیادہ بڑا سرمایہ کسی خطہ اور کسی زبان میں نہیں ملے گا۔

غالب نے انسانیت کے مقام سے انسانی زندگی کا کوئی سا پہلو ہی یا اس کا کوئی سا مسئلہ یا معاملہ ہے جس پر  
لہجہ خفہ و انداز میں انہماک خیال کر کے بارے اندر نئی بصیرت نہ پیدا کی ہو اور دم کو بہتر نہ ہی بدلنے کی کوشش نہ کی ہو۔  
ڈاکٹر محمد اکرم نے بجز انہی نے اپنا دائرہ نظر از درو دیوان غالب تک محدود رکھتے ہوئے کہا تھا کہ گورج سے تحت بکر شکل سے  
سوسنے میں بکلیں کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔ کوئی مبالغہ ہے جو اس سا زندگی کے کاروں میں بیدار یا خوابیدہ مرد



نہیں ہے وہ حکم غالب کی ماری شاعری کے بارے میں یہ کہ ہے وہ اردو و ہریانہ فارسی۔ آئیے پھر شاعر پر تجزیاتی غلط  
ٹالیاں ہانٹے۔

سب سے پہلے وہ بھیجیے کہ غالب خدا کے قائل تھے۔ رسول اور اک رسول سے ان کو کچھ عقیدت تھی حضرت  
علیؓ کو وہ بھلا مانتے تھے اور ان کے ساتھ دالہ انداز گردیدگ رکھتے تھے۔ شرح عموری کے وہ قائل تھے اور اس کے خلاف  
زندگ بسر کرنے کو وہ دونوں جہان کی رو سیاسی قصود کرتے تھے۔ وہ خود اپنی دمنخ زندگی کو گناہ سمجھتے تھے۔ اور نہیں  
ہاتھ تھے کہ کوئی انہیں نامی زندگی بسر کرے۔ مختصر یہ کہ وہ دین اسلام کو خدا کا آخری پیغام سمجھتے تھے اور اس کو کلمہ کر اس کے  
مطابق عمل کرنا ان کے نزدیک اخلاص و ادا دین کا ذریعہ تھا لیکن وہ ظاہر پرستی کے دشمن تھے اور رسوم و قیود میں غلو کو کسی  
طرح کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ رواج پرست اور لوکلٹنے کے لیے روزہ رکھنے والے دن بھر صحن حلق افطار کے اہتمام میں  
لگے رہتے ہیں اور غروب آفتاب کا جس گلی کے ساتھ انتظار کرتے ہیں اس پر غالب نے غلامی کے ایک شعر میں اس بدافست  
کے ساتھ انہوں کا انکار کیا ہے۔

حق پروری خلق فزوں شذر ریاضت

جز گزشتی افکار نہ وارد رمضان بیچ

نقد وین کا جو قصود پیش کرتے رہے ہیں اور مذہبی زندگی کا جو تعصب انہوں نے بنا رکھا ہے وہ ایک قسم کی  
سوداگری ہے جو خدا پرستی کی دُور کو بخرام کرتی ہے۔ غلط فہمیوں اور نادانیاں شرح تیس جس طول کلام سے کام لیتے ہیں  
اور جس خبردارانہ دستور زندگی کی وہ تبلیغ کرتے ہیں وہ دیا کاری ہے اور اس اسلام سے اس کا کوئی واسطہ نہیں جو  
وہی غفلت ہے۔ غالب کا نیت یا مذہب کی عمارت واری کے تحت مخالفت تھی۔ سنجیدگی کے ساتھ سمجھیں اور مزاحیہ لہجے میں  
جی۔ انوس نے بارہا ہندیاں کے تاجروں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کی ہے۔ ایک غلامی شعر میں کہتے ہیں۔

عجبہ عالم و عابد متواں کرد کہ جست

ایں یکے بید و گوداں و گریہ بید و گوداں

یعنی غزل ایک ذہنی عالم میں کسی گنی اور ان لوگوں سے خبردار رہنے کا مسلسل تقصیر ہے جو صرف صوم و خور  
کلمات سمجھتے ہیں اور اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ غالب عبادت کے دل سے قائل تھے چاہے خود صوم و صلوٰۃ کا حق نہ لیا  
کہ نیکے ہیں لیکن یہ بات سے ان کو سخت نفرت تھی اور وہ حق عبادت کے پرستے ہیں۔ یا گاری اور دانی کام چوٹی۔  
شعور کے یہ دو شعر غالب کے اصل عقیدہ کی نشاندہی کرتے ہیں اور ہمارے لیے قابل غور ہیں۔



طاہت میں تار ہے نہ مئے و انگبین کی لگ  
دورخ میں ڈال دو کوئی سے کر بشت کو

کیا نہ کو مانوں کہ نہ ہو گر چہہ ریائی  
پاداشش عمل کی طبع خام بہت ہے  
ایک جگر کس عارفانہ شوقی کے ساتھ کہتے ہیں  
وہم نہ تم چوہ کس کو بلا سکو  
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

غائب کی ساری کافر باجراٹیاں ایشیں نظر پرست اور رسوم نواز دین کی برکتیں تقسیم کرنے والوں کے  
غلات مجاہدہ ہیں۔ وہ خود ایک شعر میں بہت صفات کہتے ہیں۔

سخن کو تہ مرا ہم دل بہ تفریق نائل اسد

زنگ زارہ افتادہ بہ کافر ماحیر رائیہا

غائب عمل طور پر احکام خرچ کے پابند نہ سن لکھوہ اپنے دین کے اصول و رسوم کے دل سے معترف تھے۔  
اور اپنے عقائد میں داخل تھے۔ اس کے باوجود وہ بے انتہا کشادہ دل اور وسیع النظر انسان تھے اور ان کی انسانیت کا  
تقاضا تھا کہ اگر دوسروں کو دوسرے عقائد میں غلوں اور استحکام کے ساتھ ویسا ہی شغف اور اٹھنا کہ جے تو ہم کو ان کا  
احترام کرنا چاہیے۔ دراصل ہم کو تو یہ دیکھنا ہے کہ کون، اپنے دین کی میزان پر کس مذہب کو راہرتا ہے۔ غائب کھلے ہوئے انسان  
میں ایک جگر کہتے ہیں۔

نہیں کچھ سچ و زنا کے پھندے میں گیران

و قادیاری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

اور اس شعر کا کوئی جواب نہیں جو غریب اضل ہو چکا ہے۔

و قادیاری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے

مرے بت خانہ میں تو کتبہ میں گاڑو برہمن کو

وُنیا میں بڑا شاعر دہی مانگا ہے اور تارخ میں دہی اپنی سلک قائم کر سکا ہے جس کے کلام نے انسان کی نفرت



اگر وہ دیکھتے ہوئے اس کو پہلے سے بہتر انسان بنانے میں کوئی اہم حصہ لیا ہو۔ غالب کا شمار میں ایسے ہی بڑے اور تاریخی  
شعرا کے گھنے دانے شاعروں میں چرگا۔ ان کے ارد گرد ان لوگوں کی کلیات میں ایسے اشعار بکھرے پڑے ہیں جن سے جلنے  
کتنے ہی اشعار ایسے ہیں جو غالب و شوق و سادگت کا کمال نصاب بن سکتے ہیں۔ چند اشعار اس انتہا کے بغیر صرف اپنی  
یاد سے منتخب کیے گئے ہیں جو پیش کیے جائیں گے۔ لیکن آپ خود محسوس کریں گے کہ غالب کی کہیں کہیں باتوں میں دواغ  
و ناخ کے چند وضعیت کی کھن ہے۔ دوسرے کے دیتے ہوئے سبق کی بے کیفی۔ جن دواغ میں مجھے سب سے زیادہ  
تاریخ محسوس ہوتی ان کو سب سے پہلے ہی متاثر تھا ہوں۔

دستور گر بڑا کسے کوئی      نہ کہو گر بڑا کرے کوئی  
دروک دو گر غلط چلے کوئی      بخش دو گر خطا کرے کوئی

ان میں بھی غالب کے لیے یہی کیفیت موجود ہے اور اگر کوئی مان کر اپنی زندگی کا دستور بدلے تو اس کی شرافت  
نفس کا سیار بہت بڑا تصور کیا جائے گا۔

شاعری میں دیوانی دشت ہمزد بیت جیسے ذہنی فراہمیوں کو مساعلات و معانی میں شمار کیا گیا ہے اور زندگی  
میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ انہی خوش و خوش و خوش و خوش و خوش و خوش کے بے ربط اور بے قاعدہ قول و فعل کو نہ صرف برداشت  
کرتے ہیں بلکہ ان سے مرعوب بھی رہتے ہیں۔ غالب دشت اور دیوانی میں بھی ایک ضابطہ چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے  
کہ دیوانی اگر کوئی کتاب یا کمال ہے تو اپنے لیے ہے اور اس کو اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتے۔ ہم کو کوئی حق نہیں  
کہ ہم اپنی دیوانی کا انہار سرنا تار و مجلسوں میں کرتے ہیں۔ مجلس آداب کا احساس بہر حال لازم ہے۔ یہ شعرا اس  
قابل ہے کہ اس پر غور کیا جائے اور اس کو یاد رکھا جائے۔

و دشت کی ہماز بیگانگی نہیں

پہلے سے کہ نہ خیرے دشت ہی کیوں نہ ہو

اس غزل کا ایک اور شعر ہے جس میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ کسی کا احسان لینا ہماری بہت کو بہت کرتا ہے اور  
ہمارے کردار کو بگاڑتا ہے۔

ہنگامہ زبونی بہت ہے انفصال

حاصل نہ کیجے دھڑے جوت ہی کیوں نہ ہو

اس مضمون کو دوسری غزل کے ایک شعر میں یوں اور کیا گیا ہے



دلدار بارِ عشقِ مزدور سے ہے خم  
اے خانقاہ خراب نہ احسان اٹھائے

پہننے مزدور کا احسان لینے سے خانقاہ پر باد رہنا بہتر ہے۔

دُنیا میں کون ہے جس کو کوئی مذکور کی حاجت نہ ہو۔ اولیٰ ہوا الا کسی کی زندگی اس کیلئے مسمیٰ نہیں۔ ہم سب اس حقیقت کو جانتے ہیں اور غیر ارادی ہونے کے مقصد طور پر ذہن سے اس کا انکار بھی کیا کرتے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں اور یہ کاغذی انداز میں کہنا کرتے ہیں کہ کوئی کس کس کی حاجت پوری کر سکتا ہے اور کہاں تک۔ اب غائب کے اس شعر پر غور کیجئے۔

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند

کس کی حاجت روا کرے کوئی

ہر ظاہر غائب کی کس ہوتی بات سہلی اور ماسیاء معلوم ہوگی لیکن ایسا ہے نہیں۔ اس سے پہلے سے یہ جان یا نیم جان شعور میں زندگی کا نیا ہیرو پیدا ہوتا ہے۔ شاعر کے لہجہ میں جو پُر تامل گراں ہے اس کے شفق دار میں جو افق ناز اور ہمدی اس سے ہم کو یک نئی بصیرت ملتی ہے جو ہم کو اس قابل بناتی ہے کہ ہم معاشرہ کی اس کلی اور عمومی حقیقت کو سنجیدگی کے ساتھ سمجھ سکیں اور اگر اس کا کوئی مذاکر ممکن نہیں تو خاموش رہیں۔ یہ خاموش جھوٹی یا بھول جھوٹی یا پاکارتے قفس سے زیادہ جلیل ہے۔

اس مسئلے میں اب ایک اور شعر ملاحظہ فرمیں یہ بتایا گیا ہے کہ صاحبِ حاجت کو کیا روش اختیار کرنی چاہئے تاکہ اس کے انسانی تاسوس کی سالمیت اور وقتِ مکرر نہ ہونے پائے۔

بے طلب دیں آخر وہ اس میں سوا ملتا ہے

وہ گرا جس کو نہ ہو غوئے سوال اچھا ہے

غائب سے پہلے کبیر داس بھی ہم کو یہی تعلیم دے گئے ہیں۔ اسی کی ایک دین ہے جو مزبِ الشک پر بھی ہے۔

ہیں مانگے سود و دودھ برابر مانگے ملے سودیان

کبیر داس کی یہ روایت برابر جائز و چارہ آتی

جو مانگے بغیر ملے وہ دودھ جو مانگے ملے وہ پانی ہے لیکن بے مزہ ہے اور جو جھگڑے فساد سے ملے وہ خون

کے برابر ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے نبی اکرم کی حدیث ہے۔ ہاندی نفسِ حیدہ مالاں یا خذ



احکم حبلسے فیہ حطب علی ظلمہم خیر کم من ان یأتی دجلۃ فیما لہ اعطاء اور منع۔  
یعنی اس سبکی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم میں سے جو شخص ہاتھ میں دس لے اور اپنی بیٹی پر بکریوں کا گٹھا  
لاوے اس کا یہ کام اس سے زیادہ نیک ہے کہ وہ کسی شخص سے سوال کرے اور وہ اس کو کچھ شے لے یا انکار کرے۔ مگر  
جب خود غالب کو "اہل کرم" کا گٹھا دیکھتا اور ان کی پراسیدال طبیعت کا مطالعہ کرتا ہوتا ہے تو وہ فقیروں ہی کا جیس بنگار  
نکلتے ہیں۔

غالب کی شاعری بہ یک وقت ہمارے دل اور دماغ دونوں کو آسودہ کرتی ہے وہ ہمارے احساس و فکر کو نئے  
انداز سے چیر کر نکالتے ہیں اور نئی روشنی میں نئے پہلوؤں اور زاویوں کی طرف دہن لگاتے ہیں۔ وہ دل و واردات اور  
ذہنی کیفیات کو صرف بیان کر کے نہیں رہ جاتے بلکہ ان پر استفسار اور تامل کی تلقین کرتے ہیں غالب کی اصل زندگی یہ  
ہے کہ وہ کائنات کی ان بات کے مابعد الطبیعیاتی حقائق کی معرفت دیکھتے ہوئے داخلی اور انسانی زندگی اور اس زندگی کے برسرِ  
اور ہر سطح کے شاعر ہیں۔ وہ اس راز سے واقف ہیں کہ حقیقت کی مختلف سطحیں جوتی ہیں اور وہ کئی پہلو رکھتے ہیں جو ایک  
دوسرے سے الگ ہوتے ہیں مگر ایک ہی مکمل آہنگ ہوتے ہیں۔ غالب کے کلیات نظم (اردو و فارسی) میں ایسے اشعار کی  
کمی نہیں جو بہ ظاہر غنوم کے اعتبار سے ایک دوسرے کی تردید کرتے معلوم ہوتے ہیں بلکہ وہ حاصل ایسا نہیں ہے مثال  
لے طور پر فرخاد شیریں اور خسرو کی تمیزات سے کام لے کر شاعر نے انسانی زندگی کے ایک ناگزیر میلان یعنی عشق سے  
متعلق کچھ نکتے ہم کو گھماتے ہیں جو قابلِ غور ہیں۔ غالب فرخاد کی عظمت کے قائل ہیں۔ جدویت سے دو دھاترنگ نفس  
انسانی کی تفریب میں عشق نے جو جھٹکا دیا ہے اس کی ایک تائید ہے اور اس تائید میں فرخاد ایک ممتاز مرتبہ رکھتا ہے جو قابلِ  
دلک ہے۔ عشق نے وہ میں فرخاد کی سن و کلاوش کا احترام و احترام کرتے ہوئے غالب کہتے ہیں۔

کیست کہ کوشش فرخاد نشان بازوچ

مگر آں نقش کہ از پیش بہ خارا ماند

اور ہر ایک دوسرے شعر میں اس دلولہ اور فخر کے ساتھ کہتے ہیں

از رنگ بہ خون غنم و از ذوق پر غنم

دل پیشہ کہ در پنج منہ باد بہ جنبہ

ایک جگہ آشفہ سراہی عشق کی جہالت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان الفاظ میں کہتے ہیں۔





ہمیشہ میں عجب نہیں رکھئے نہ فریاد کو نام

ہمیں آشفۂ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

لیکن شاہنشاہ کی ہر سختی نگاہ فریاد کی زندگی کے دوسرے ناولوں پر چڑتی ہے اور وہ اپنی طبیعت صداقت پرکتا  
عجب دہر کر فریاد کے خلاف فتویٰ صادر فرماتے ہیں۔ ورنہ گمراہ نہیں دیتے۔ سب سے پہلی بات جو فریاد کے گمراہی کی نکتہ  
ہے وہ اس کا روایات پارہ نہ کا پابند ہونا ہے۔ ورنہ غلط فہمی تو آزاد ہوتا ہے۔ سانس کو روایت پرستی سے کیا واسطہ اس لیے  
نائب کچھ دلاس کے ساتھ کہتے ہیں :-

ہمیشہ ہنسید مر د سکا کو حکمی اسد

مرگشتہ غمار رسوم و قیود تھا

حقوق کا اپنا ایک ناموس ہے اور اس کی اپنی ایک خیریت ہے۔ مرد و سب و آئین اور رسوم و قیود اس  
پر طایفہ نہیں کیے جاسکتے۔ ایسے قبولِ ناموس کسی قاعدوں اور طریقوں سے عاشقِ محبوب کو نہیں پاسکتا۔ اور اس کی دلی ملاو  
بھری پوری نہیں ہو سکتی۔ غالب کو شش فریاد کے ایک نئے رُخ کو ہمارے سامنے لا کر عشق کی اضطراب آزاد کا احساس دلاتے ہیں  
کو محکم نقاشِ یک مثال شیریں تھا اسد

سنگ سے سرمایہ کر جو دے نہ پیدا آشنا

یہ شعر اس بات کی شہادت ہے کہ ایران کے ساحل پر تواریخ اور اس کے ادبی اور تمدنی روایات تو قریباً  
غالب کو کتنا مجبور حاصل تھا۔ شیریں اور فریاد کی داستان کے شغف رکھنے والوں میں شاید ہی کوئی اس روایت سے واقف  
ہو کہ جب فریاد شیریں کی شرط کے مطابق پہلا کات کر چائیں نیچے دریا اکشادت پادریا نے سیوں میں گرنے لگا نہ دیا کاؤرخ  
بجز سوزِ جگر کی طرف مڑے تو اس نے اپنی توجہ اور تکیس کے لیے پہاڑ اپنی فکر کے سامنے ایک جگہ صاف کر کے شیریں کا  
ایک نقش بنالیا تھا۔ جب تک جاتا تھا تو اس نقش کو دیکھ کر تازہ دم ہو جاتا تھا اور پھر نئی اسنگ کے ساتھ پہاڑ کاٹنے میں ہمت  
ہو جاتا تھا۔

لیکن غالب کی طبیعت جس بات کو کس طرح قبول نہیں کر سکتی وہ یہ ہے کہ فریاد و دل کی آرزو سے اس قدر بے قابو  
ہو گیا کہ قہرِ شیریں تک پہلا کات کر خرم جاری کرنے کے لیے تیار ہو گیا اور یہ دسواں جاکر یہ تو قریب کی جواہک جابر شہنشاہ ہے  
مردوں کی کرتا ہے اور اس کے لیے ہمیشہ و قتل و سبک دہاں کرنا ہے۔ مگر جب ازل و اشدھار میں غالب اپنے اس ماکڑ کا انداز رکھتے ہیں



عشق و مزدوری عشرت گز خسرو کیا خوب  
ہم کو تسلیم نہ کرنا منہ سدا نہیں

لو حکم گرسند خسرو در طرب گاہ رقیب  
بے ستوں آئینہ خواب گراں شیریں  
یہاں خائب نے فرما دیا شیریں اور بدین کی اس داستان کو تسلیم کر لیا ہے جو فارسی شاعری نگاروں کے نزدیک مقبول  
اور دلچسپ ہو گئی تھی اور جو اصل داستان سے بالکل مختلف ہے۔  
خائب کی نظریں انسان کا درجہ ایک مخلوق کی حیثیت سے بہت بلند ہے اور انسانیت ایک بہت بڑی فضیلت  
ہے جس کی برقرار رکھنا مشکل ہے۔

آدمی کو بھی میر نہیں انسان ہونا  
اور خائب جانتے ہیں کہ آدمی یا انسان کا امتیازی نشان مردانگی یا عورت ہے اگر انسان مرد اور مکمل نہ ہو نہیں  
ہے تو وہ کچھ نہیں ہے اور مرد کی پہلی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں عشق کا درد رکھتا ہو اور یہ درد عشق پر خوش سے کیا کہلا  
انگریز ترجمہ کی شکل میں ظاہر ہو انسانی ہستی اور عشق خائب کے تصور میں ایک ہی قوت کے دو نام ہیں عشق ایک فعل اور فاعل  
قوت ہے جس کو ہر آدمی کہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ کہیں کہیں خائب نے عشق کا وہ تصور پیش کیا ہے جس سے عوام ہلکا  
اور بالوس ہیں۔ مثلاً :-

عشق نے خائب ٹکڑا کر دیا  
درد نہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش خائب  
کہ لگاتے نہ لگتے اور بجھائے نہ بجھتے  
مگر یہ اس لیے ہے کہ جیسا کہ پہلے امراء کے ساتھ کہ چکا ہوں خائب زندگی کی ہر سطح کے شاعر تھے۔ دردناک کے  
فہم بشر میں عشق کا تصور تصویروں کے اہدام کے بغیر چمکا نہ تھا اور اس کا وہی مقام ہے جو دیگر انسان کے وہاں قوتِ حسیہ تھی  
(ELAN VITAL) یا درودِ آئینہ کے وہاں کا زور و حافی حرکت (INDEPENDENT SPIRITUAL)



Passion) کا ہے۔ یعنی غلبہ کے ذریعہ میں عشق اور زندگی باہم متراوت ہیں۔ وہ جنسی تحریک جس کو کام زبوں میں عشق کہلاتا ہے وہ بھی عشق کا ایک روپ ہے۔ عشق ایک آواز تخلیق قوت ہے اور اس کا پہلا مظاہرہ آثار اور قرانی ہے۔ مجبوری واپسی ہستی کی ملاحق کی فکر کا عشق کے ساتھ گندہ نہیں۔ خواجہ حسن دہلوی کا ایک شعر ہے۔

حسن اور عشق کی دونوں چیزیں از جاں چے یار دلی  
بیک دل و دلی گنبد خم جان و خم جان  
اسی خیال کو غالب اپنے انداز میں ادا کرتے ہیں۔

سراپا رہی عشق و ناگزیر الفت ہستی

عبادت برق کی کرتا ہوں اور سنوس حال کا

یعنی اگر غرضی ہستی کی فرشتہ ہے تو عشق کے قریب نہ جاتی عشق تو ایک جلی نہا اپنے پرستاروں سے ملدی ہستی کی بھینٹ چاہتا ہے۔

اس سے چھ بھی ایک شعور ایسا بچکا ہے جس کا غم ہی ہے کہ پہلوں و فاکے ہاتھ کا آواز ہو ناکازی ہے۔ اگر زندگی کی دلی اور کثیف مجبوریوں سے آزاد اور نہ تیار نہیں ہو سکتے تو محبت اور وفا کا نام نہ لو۔

غالب کی ایک بہت بڑی دوس جرات اظہار ہے چاہے خدا کے سامنے ہو چاہے عشق کے سامنے وہ استہانہ بریاں کے ساتھ حق بات کہہ دیتے ہیں اور خدا کے دہرو بندے اور عشق کے دہرو عاشق کا اور وقار قائم رکھتے ہیں۔ یہی ان کی جرات اور بریاں کی تہذیب اور شائستگی کی تہذیب حسنہ زائستہ ہوتی ہیں۔ یہی ان کی لہجہ کی تہذیب کی تہذیب جلی غالب سے اور بہت کچھ سیکھا ہے وہ ان اظہار کا یہ راستہ چکان اور جرات مندار حلیہ بھی سیکھا ہے

غالب کے کلام سے اس زمانہ کی چند شاخوں پر غور کیجئے جو اپنی ایک منفرد شان کی حامل ہیں۔ ایسے میلان فکر اور ایسے طرز بیان کے نونے غالب سے پہلے یا بعد ان کے عہد میں یا بعد ان کے بعد کسی اور دو یا تیس کے شاعر کے کلیات میں نمایاں ہیں۔

بچڑے جاتے ہیں فرشتوں کے کھسے پر ناسخ

آئی کوئی ہمارا دم تحسیر بھی تھا

نار و دھن ہوں کی بھی حسرت کی لے داو

یارب اگر ان کردہ گناہوں کی تزا ہے



آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شہرِ یاد

مجھ سے مرے گھر کا سبب لئے غلامِ ناگ

شاید ہی کوئی صاحبِ ادب ایسا ہو جس کے دل میں کبھی نہ کہیں اس قسم کے احساسات یا خیالات غلط نہ پیدا کرتے ہوں لیکن ایسے کتنے ہوں گے جو زبان سے انہماک کی جرأت کر سکیں یا جس اس تربیت یافتہ منطقی مہر میں انہماک کی قابلیت رکھتے ہوں۔ جیسا کہ شوقی، گستاخی، ظرافت اور طنز کے بھی کچھ آداب و ضوابط ہوتے ہیں۔ جس احساس کا آخری دو شعروں میں انہماک دیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے وہ غالب کے شاعرانہ تخیل کی کوئی دقیقہ نہیں ہے بلکہ ان کے دل کی ایک مستقل آواز ہے۔ ایک خاص شعر میں بھی وہ اس احساسِ حوا میں کوئی بیان کرتے ہیں۔

انہماکِ روزِ گزشتہ پرشِ روزِ ہرچہ گزشتہ

کاشش با ما سخن از حسرتِ مایہ کن

اور غالب کے جو مولدِ نگاہ اور حسرتِ مہیاں کا اندازہ اس شعر سے کیجئے۔

دریاے ساسی تنگ آئی سے ہوا خشک

میرا سروامی بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

لیکن غالب کے جو مولدِ نگاہ اور ان کے جیسا کہ مہر اور غلطی کی بہترین مثال ان کی طویل شاعری آہِ گمراہی میں حتیٰ کہ جو شہزادوں میں شامِ کار ہے۔ غالب ایک شعر میں کہ چکے ہیں۔

زندگی بچی جب اس شکل سے گزری غالب

بم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے۔

اب غزلی آہِ گمراہی کے جو مقرب اشعار پیش کیے جاتے ہیں جس سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ تربیت یافتہ اندازِ کلام اور شائستگی گفتگو کس کو کہتے ہیں۔ خدا کی شانِ فدائی۔ اس کی قدرتِ مطلق اور جزوِ کل میں اس کی مشیت کا فدائی کا بیان ایک ایسی جگہ ہے جس کی نظیر شکل ہی سے کہیں ملے گی۔ یہاں بھی شاعر کے منفرد انداز کا احترام کرنا چاہیے لیکن غزلی کی ندرت وہ حصہ ہے جس میں اور شعر کے سامنے اصل ایک و بدیہیزان میں آئے جیسے والے ہیں اور جزا و سزا کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ ذرا نیچے غالب اپنے گناہوں کی مصیبت کا احساس قائم رکھتے ہوئے اس بات کا راز اور پُر اہتمام ہے۔



بروئے کہ مردم شوند انجمن  
 شود تازہ پیوند جان تا بہ تن  
 بہ ہنگامہ ہا میں جگر توشہ گان  
 دو آئینہ ششہ جگر توشہ گان  
 ز حسرت بہ دل پردہ دندان فرو  
 ز مجاہد سر اندر گریبان فرو  
 در آں حلقہ من ہاشم و سینہ  
 ز غم ہاشمہ آیام گنجینہ  
 در آب و در آتش بسر بردہ  
 زو شوارخی زلیستی مردہ  
 اپنا یہ حال بیان کرنے کے بعد تو رائیٹے ملک حشر سے درخواست کیا کرتے ہیں۔  
 بہ ہشتائے برنا کسی ہاشمہ من  
 جہی دست و در ماندہ ام ولتے من  
 بہ دوشش ترازو منہ بار من  
 نہ سنجیدہ ہ جگزار کرواد من  
 بہ کرواد سبجو میغزائے رنج  
 گراں بارقہ درد عسیم بہ سنج  
 اگر دیگراں را بود گفت و کرد  
 مرا نایہ عمر رنج است و درد  
 منہر و حق کہ حسرت غیر من است  
 دم سرد من ز ہریر من است

ایک چندہ مجبور کی زبان سے ایسی درخواست اور فرمائش کے ہم میں اور پھر کس سے۔ ایک ایسی بستی  
 سے جو ساری کائنات کا آفریدہ گار اور پروردگار جو جو معنی رکھتا ہے اور جس کا کام قیامت کے دن داوری کرنا اور انسان



کے اہل انجیل اور یہودی کے اعتقاد سے تو ان اور مسزاد سزا کا حکم صادر کرنا ہے جس کی حیرت کی جائے کم ہے لیکن غلبہ کے لیے میں نہ خون ہے نہ شرمندگی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غلبہ کو یقین ہے کہ وہ ہر کچھ خور واری کر رہے ہیں وہ جتنی ہے اور میں زندگی میں کو میری تھی اس میں وہ وہی کر سکتے تھے جو وہ کرتے رہے لیکن بات میں ختم نہیں ہو جاتی جب غلبہ کے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید ان کی شنوائی نہیں ہوگی اور ان کے اہل انجیل پر سس اور پاؤش سے بکڑے ہوئے تو وہ نیروگاہوں کا بچہ اختیار کرتے ہوتے اس سے بھی زیادہ شرفی کی حد تک بڑی ہوئی صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔

وگر ہم چہین ست مسز جام کار

کوی باید از کردہ راندن شجار

مرا نیسند یا راستے گفتار

ہو گیم بر آں گفتہ زہار

دریں مسئلہ پادش از من جو

بود بندہ نعت گستاخ گو

دل از فتنہ غول شد فتنی چہ سود

چو ناگفتہ دان ذہن چہ سود

زبان گرے من دارم اما زنت برکت ار چہ گفتارم اما زنت

بما تا تو دان کہ کافہ نیم

ہستار خورشید و آذر نیم

ذکشم کے راہ احمد میں

نہ بردم ذکس مایہ در دھننی

مگرے کہ آتش بہ گرم از دست

بہ ہنگار پرواز مورم از دست

من اندو حلیس وے اندہ رہائے

چہ ی گرم اسے بندہ پرور ذلتے

اور اگر باڑی پس کرنا ہی ہے تو پھر۔



حساب سے ورامش و رنگ و بُو  
 زحمتیہ و ہیرام و پرویز جو  
 کہ از بادہ تا چہرہ اسنو وقتند  
 دل دشمن و چشم بد سوختند  
 بحر سے کیا پچھتے ہو جس نے کبھی خیرات سے کبھی قرض لے کر گاہ بگاہ دو گھنٹہ لپک کر منہ کالا کر لیا ہو۔  
 نہ از من کہ از تاب سے گاہ گاہ  
 بد ریوڑہ رُخ کردہ باشم سیاہ  
 شہانگہ بہ سے رہ تو نم شدے  
 سحر گر طلب کار تو نم شدے  
 تنائے معشوقہ بادہ نوش  
 قناعتائے بیودہ سے منوش  
 چہ گویم چہ ہنگام گفتن گذشت  
 زمر گراں مایہ بر من گذشت  
 بسا روزگاروں پہ دلدادگی  
 بسا فوجہاراں پہ سبے باوگی  
 اتفاقاً پر از ایر بہمن میں  
 سخاوت حب م میں از مے تھی  
 جہاں از گل و لالہ پر بستے و رنگ  
 میں و عسبرہ و دانے زیر رنگ  
 چہ خواہی زدن سے آلود میں  
 بہ میں جسم خیاڑہ ہنر سود میں  
 اندھیرا دہی سے پچھتے ہیں ۔



یہ فسرمانے لیا داوری چوں بود  
کہ از جسم من حسرت افزوں بود  
اور یہ سب کچھ کہ پلٹنے کے بعد اھوار کے ساتھ وہی طلب  
بہ بند امید استواری فرست

بہ غالب خط راست نگاری فرست

یہ یاد رہے کہ غزنی کی ابتدا احمد سے ہوئی ہے اور جس جھڑ سے یہ اشعار لیے گئے ہیں اس کا عنوان تنہا جات ہے۔ دو میان میں ایک حکایت بھی آگئی ہے۔ اس کے بعد نعت ہے۔ معراج کا بیان ہے عقبت ہے اور غزنی کا ناتر مغنی نامہ اور ساقی نامہ پر جوتا ہے اور اتنی طرحی ہونے کے باوجود غزنی ناقام رہ گئی ہے۔ اگر وہ مکمل ہو جاتی تو نہ جانے کیا چیز ہوتی۔ جس طرح غالب نے آنکھیں براہِ کر کے داود عرش سے گفتگو کی ہے وہ نہ صرف اس امر کی دلیل ہے کہ غالب کو اپنے گراما اپنے اھل پر اعتماد ہے بلکہ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو یقین ہے کہ داود عرش بہر حال اپنا ہے اور اپنے بندوں کی بدافہاسی گوارا نہیں کرے گا۔

اب سے کوئی ۱۴۵ء ۱۹۰۴ء سال پہلے کی بات ہے کارلائل (CARLYLE) کی شہرہ آفاق کتاب بھل اور میں پڑھتی تھی (HERO AND HERO-WORSHIP) میرے نصاب میں تفصیل مطالعہ کے لیے داخل تھی پڑھانے والا ایک تازہ دار اور فاضل انگریز تھا جو آکسفورڈ سے انگریزی ادب میں فارغ التحصیل کی سند لے کر آیا تھا یہ کتاب ختم ہو گئی تو دوسری کتاب مشرّع کرنے سے پہلے اس نے جماعت کے لوگوں سے یکے بعد دیگرے سوال کیا کہ "بتاؤ اس کتاب کا مرکزی تصور کیا ہے؟ جب کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ میں نے کہا جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں کتاب کا مرکزی تصور یہ ہے کہ بھل یا نابینا بہر حال میں بھل یا نابینا رہتا ہے۔"

آٹھ میں سوچا ہوں تو کارِ عالم میں گنتی کی چند بستیاں ایسی نکلیں گی جو میرے اس قول کی تصدیق میں پیش کی جا سکیں۔ انہیں چند ستیوں میں غالب بھی ہیں اور کسی سے چھپے نہیں ہیں۔ میں اس سے پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ غالب جس ملک میں بھی پیدا ہوتے اور جس زبان پر بھی قدرت رکھتے وہ فکر و فن میں دنیا کی عظیم ترین شخصیتوں کے ہم پیر ہوتے اس کا ثبوت ان کا اردو اور فارسی کلام ہے۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ غالب شاعری کی کم و بیش ہر صفت میں اپنی انبیاء کی شاہی پیدا کر لیتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ غزلِ قصیدہ اور غزنی میں تو وہ کیسا عظیم الشان ہیں۔ تینوں اصناف میں اتنا ذکاوت و طرزِ مریاں دونوں کے اعتبار سے وہ مساوی قدرت کے ملک ہیں۔ اگر ان کی غزلیں سنانے نہ





ہوں اور صرف اس کے قصیدوں کا مطالعہ کیا جلتا تو وہ قصیدے کے شاعر معلوم ہوتے ہیں اور ان کی غزلیں اور قصیدیں کبھی نہ جانتے تھے ان کو غزلیں کا تذکرہ ان کا نام شاعر مانتا نہ تھے گا اور غزل کے شاعر تو وہ ہیں۔

غالب کی شخصیت اور اس کی شاعری کی صحیح قدر متعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اردو و ہندی کے ساتھ ان کے کلیات نظر فارسی کا بھی ذوق و تامل کے ساتھ مطالعہ کیا جائے لیکن اس پر مبنی فارسی کے ساتھ دلی پہنچ دھیرے دھیرے کہ اس طرح شوق رہی ہے کہ حصہ اعز کے پڑھے دیکھے لوگ فارسی ادب کے ذوق سے بالکل معذور ہو گئے ہیں غالب کے مشہور ترین ناقدین نے بھی ان کی فارسی شاعری یا شری کارناموں کی طرف کوئی خاص اہمیت نہیں دیا۔ ایسی صورت میں ڈاکٹر عارف شاہ گیلانی کی کتاب شہنشاہ سخن ایک نعمت معلوم ہوتی ہے جو غالب کے کلیات و نظم و نثر پر ایک خاکہ ہے اور نئے ذوق تحقیق و انصاف کے جسد تیار کی گئی ہے۔ کاش یہ کتاب غالب کے ساتھ شفقت رکھنے والوں کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہو سکے۔

غالب کا تصور نہیں میں آتے ہی مغرب کے بہت سے قدیم و جدید مشاہیر فکر و فن کی بھی یاد آئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تعاقب تنقید میں بہت سے خطرے ہیں۔ تنقید غالب کے سلسلے میں اس طرز افکار میں ڈاکٹر عبد الرحیم بخاری مسلم اول کا درجہ رکھتے ہیں۔ مغرب کے کسی حمد کا شاید ہی کوئی فلسفی شاعر ہو جس کو غالب کے مقابلہ میں نہ لایا گیا ہو۔ یہی نہیں یورپ کے عظیم سے عظیم نقادوں سے بھی غالب کو شاب و کھایا گیا ہے۔ ڈاکٹر بخاری علیٰ علم و فن سے قابل عقیدہ و تحقیق رکھتے تھے اور انہوں نے کہیں کوئی غیر متعلق بات نہیں کہی ہے پھر جن تھامس کام غالب پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ کہنے والا ایک خطرے کا شکار ہو رہی گیا جس کو اگر غور کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ جہاں کسی ایک عظیم شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے کسی مائت کی بنا پر کسی دوسری شخصیت کا نام یاد کیا تو سننے والا یا پڑھنے والا خود اپنے ذہن سے پیدا شدہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ جہاں وہ شخصیتوں کے ساتھ نام لیے گئے ہیں وہ برا اعتبار سے مساوی اور ہم وزن ہیں گئے۔ وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ مائت کے معنی حیثیت یا برتت نہیں ہوتے۔ میں خود جب غائب کے بارے میں سوچتا ہوں تو شرق و غرب کے اکثر حکماء و شعرا اور ادباء اباب فوق و نظر اور اصحاب اسایب و صمدی کے سامنے یاد آجاتی ہے۔ تخلیق یا کوئی فساد کے تصور کا جہاں نمک تعلق ہے غائب کے کلام میں افلاطون، ارسطو اور فلاطینوس سے ابی رشید اور ابی العری ای عربی تک اور علی العری ای عربی سے بنگلہ نشے، پیرگاہن اور دوسرے ہر ذہن کا جھلکیں مل جاتی ہیں۔ فارسی کے جن شاعروں کی یاد غائب کے معانی کے دوران آتی رہتی ہے ان کے نام لگانے کا مجھے ہیں۔ مغرب میں جرمنی کا آغا شہرت رکھنے والا



علی گڑھ اور انگلستان کے شاعروں میں دور رس و سرفراز شاعر اور براؤننگ غالب سے بہت کافی قرب رکھتے ہیں۔  
غالب کا نظریہ نظم اور ان کی دانشورانہ عظمت ہم کو کبھی مقررہ کی اور کبھی زبان کے مشورہ ایسے نگار سفر طرز کی یاد دلاتی  
ہے۔ اس کے یہ سنی آواز ہرگز نہیں کہ غالب اور یہ گنائے ہوئے مساندہ ہوجینیات میں مساوی اور اصلاحیاد پر مساوی لانا گیا  
ہیں۔ یہ تو صرف اس امر کی دلیل ہے کہ حقیقت کس ایک حک یا ایک حمد یا چند مخصوص افراد کی میراث نہیں بلکہ ہر قوم اور  
حمد میں ایسے صاحب نظر اور صاحب دل پیدا ہوتے رہتے ہیں جو حقیقت کی جھلکیاں دیکھ لیتے ہیں۔ دنیا کے اہل پیش  
اور ادب و فنش ایک اخوت ہیں۔ یہ اخوت بدویت کے زمانہ سے تا حال زندہ اور کارفرما ہے اور ہمیشہ زندہ اور کارفرما  
رہے گی۔ غالب ہی اس اخوت کے ایک عظیم اور موثر رکن ہیں۔



## خالجے : اندازِ بیاں

نہیں گر سسودہ برگ اور ایک مہنی  
تماشا کے نیرنگ صورتِ سلامت

اس کے تیس پینتیس سال پہلے کی بات ہے کہ فنی کاری (ART) کے لیے اردو میں ایک دوسرا حراون لفظ استعمال ہوتا تھا جسے خوش کاری یا آج اس لفظ کو لوگ بھول چکے ہیں لیکن آج بھی اس کی اڑھ فنی کاری یا آرٹ کی ہر فنِ تعریف میں کہیں محسوس کہیں غیر محسوس طور پر کام کر رہی ہے۔ چنانچہ تعامل فنی کاری کے نظریات کو تعلیمات ہی کہا جاتا ہے۔ فنی دراصل خوش آفرین کا نام ہے اور خوش انظار کا نام ہے۔ کہو چھ انظار نام ہی کا دروست حسن بناتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ قبح میں تو درجہات ہوتے ہیں لیکن حسن میں درجات کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن انظار ممکن ہے یا نہیں اور حسن میں درجات ہوتے ہیں یا نہیں یہ خود اپنی جگہ ایک جدا موضوع ہے جو مستقل بحث چاہتا ہے۔ یہاں یہ بحث بے محل ہو گی لیکن اس سے انکار نہیں کہ حسن انظار ہی میں ہوتا ہے۔ میں نہیں جکڑنا اور جوہر کی انظار ہے جو مرض انظار میں نہ آ سکے یا نہ آچکا ہو وہ لاہرود ہے یا بے قول خالجبے۔

تمثالِ نازِ جلوۂ نیرنگِ اقبال

مبہوتی دم ہے آئینہ گرد و بدو نہر

اس کے یہ سمجھو جسے کہ حسن اعیان میں نہیں ہوتا بلکہ ان مظاہر میں ہوتا ہے جن کے ذریعے اعیان اپنے کو ظاہر کر کے اپنا وجود ثابت کرتے ہیں۔ اگر کسی میں الاحیان یا حسنِ مطلق کے تصور کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ حسنِ مطلق یا معشوقِ حقیقی اپنی مطلقیت میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہے اور ہم اپنی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس حساس تہذیب سے گہرا ہے اور اپنی تہذیب کو دور کرنے اور خود کو دیکھنے اور دکھانے کے لیے تہذیب و صورتوں میں اپنے عیروہم و انتقاد کرنا



رہتا ہے۔ نہ ہونے لگتے مابین اگرچہ ہے پھر بھی اس کا ذوق خود نکالنا اور بظہر تحقیق آسودہ نہیں ہر پارہ ہے اور کائنات پر کائنات پیدا کرنا ہمارا ہے اور یہ سلسلہ آباد جاری رہے گا۔

غرض کہ حسن عالم صفات یا عالم نگاہ میں ہے جیسے حسن کا تعلق جسم و صورت ہے یہ اور بات ہے حسن روز اقبال سے کثافت سے لطافت کی طرف آئی ہے اور استاذ زمانہ کے ساتھ لطیفہ ہوتا ہمارا ہے اور ظاہر ہے باطن اور مادہ ہے مجیدہ ترک است حسن کا حجم کا نظری اور لائق ہے۔

اب اگر دھرم اور حسن مترادف ہیں اور حسن انہار میں ہے تو انہار میں قرینہ یا جنہار یا اسلوب یا ادھک کا بہرہ لائی ہے۔ اسلوب یا قرینہ کے بغیر انہار مملکت سے ہے اور قرینہ یا اسلوب کا تعلق بہت بڑی حد تک اس ذات یا فرد سے ہوتا ہے جو انہار کر رہا ہو۔ اس کے یہی معنی نہیں کہ اسلوب انہار مخرج یا مواد سے ہے واسطہ ہوتا ہے۔ ہم اکثر کہتے ہیں کرات کے کا ایک ادھک ہوتا ہے۔ یہ اختار ہے اس حقیقت کی طرف کہ مخرج چاہے روز بنی امور سے متعلق ہو یا خدا کی مملکت سے اپنے انہار کا اسلوب خود تھیں کہ ہے لیکن یہ اسلوب ظاہر میں متعلق نہیں ہوتا بلکہ اس شخص کے یہی میں متعلق ہوتا ہے جو کسی مخرج کو متعجب کر کے اس پر اپنے اثرات یا خلیات کا انہار کرنا چاہتا ہو۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلوب کے تصور کے ساتھ ہی اس کے انہار کا اسلوب بھی ٹھکرانی کار کے ذہن میں شکل پذیر ہو جاتا ہے۔ ہر شخص کا اسلوب ملک ہوتا ہے اس لیے کہا گیا ہے (STYLE IS THE MAN) یعنی اسلوب ہی شخص ہوتا ہے۔ ہر شخص کی شخصیت اس کے اسلوب سے پہچانی جاسکتی ہے۔ یہ قول دنیا کے تمام اکابر فکر و فن پر صادق آتا ہے۔

غالب ہی انہیں اکابر میں سے ہیں اور وہ ٹھکی کائنات اور فن کے اندرونی ترکیبی عناصر سے قطع نظر صرف اپنے عنوان انہار سے پہچانے جاسکتے ہیں۔ ان کی نثر سرائی ہمیشہ ایک اور نئے خاص کی حامل ہوتی ہے جہاں کی ان کی شخصیت کا ڈھنڈا دار ہوتی ہے اور جو کسی دوسرے سے منسوب نہیں کی جاسکتی۔ ٹھکر و بصیرت میں تو غالب ایک نمونہ کار ہے کہتے ہیں میں لیکن ان کا آثار بیان بھی ٹھکر اور ہی ہوتا ہے اور زبان اور اسلوب انہار میں بھی ان کے اختراعات پر ان کی اپنی مہر ہوتی ہے۔

حسن کی تعریف میں جو کچھ بھی کہا جاتا ہے اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ غالب سے بڑھ کر ان کے پیادہ بزرگ یا شاگرد اور جہل پرست گفتگو ہیں کے چند فنکار نکلیں گے۔ غالب حسن کے آئینہ نگار بھی تھے اور حسن کے ہستار بھی اور ان کی تہ ہے کہ ہر حسن کا تخیل اور تصور میں ہر ستار ہر گاہ وہی حسن کا آئینہ نگار ہو سکا ہے اور یہ کہ پہلے کہا جاتا ہے کہ حسن کو ایک خاص قرینہ کے ساتھ صورت یا مواد کو ایک مناسب بنیاد کے ساتھ



ہنیت حکما کرنے کا نام ہے۔ دوسرے الفاظ میں حسن صورت گری یا پیکر بندی ہے۔

توسیع پہاٹی ہے جس نے کوڑا کو پاتاؤ لیتا انعام بنایا۔ خاص موسیقی میں یہ آواز سروس کی شکل میں برتن ہے  
پنہ دلیچے لفظ چتر کی ہوتی ہے جس کے دلیچے کوئی خاص سطح پر انہیں ہوتے ٹکڑوں میں لایے الفاظ استعمال کرنے  
کئے ہیں جس کے دلیچے کوئی مخصوص غرض پیدا کرتا تو اس خاص موسیقی شاعری میں منتقل ہونے لگتی ہے اس سے یہ تجربہ  
لگتا ہے کہ جہاں تک غلیظ شاعری و نظم اور سبکی مزید ارتقا کی صورت نشتر میں جہاں شکر کا تس ہے وہاں کے حسن کا بنیادی  
مغز و محرق آہنگ ہے جو حسن و لطف کا ایسا قریب سے پیدا ہوتا ہے جس میں نہ نثر کا کلام ہے نہ شاعری کا کلام بلکہ ایک  
نثری ہی تمام الفاظ اور ذائقہ کا بہتر شاعری ہے جو شاعری میں نظم کی یکسوئی اور کلمات کی ہے اس طرح میں ایک سبب  
مشاد کو کہیں یہاں شاعری کے طور پر خیال آتا کہ زبان کا جتنی شاعری کی خصوصیات خوشصورت کے مغز کی پائنت کر  
جرحاتی میں یکساں گزرا شاعری میں شاعر داخل ہوجاتے تو شاعری دنیا نثر سے مجھ زیادہ بہت ہوجاتی ہے۔

غالب شاعری کے اس درجے آگاہ تھے۔ اگر نظر غائر غالب کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ محسوس  
کرنے میں پور نہیں لگے گی کہ شاعر اس طعن کے اسرار کا حلف ہے جو پیکر و صولت میں ہر تکبہ عداوت کے بغیر حسن  
حقیقت یا حسن میں تنگ و سائی حال ہے اور اس پیکری حسن کا پہلا سرعہ حق آہنگ ہے۔ غالب اس دوزخ آشنا  
تھے اسی لیے وہ نیزنگ صورت کے متحمل تھے اور دوسروں میں اس کا ادراک پیدا کرنا پاجتہ تھے۔

غالب افکار اور الفاظ کے درمیان مکمل آہنگ کے حامل تھے۔ ان کے اسلوب میں ہر ایک وقت تخلیقی  
ترتیب اور جالیاتی قبضہ کا احساس ہوتا ہے۔ الفاظ جوں و انشیات و استعارات یا دوسری صنعتیں وہ ان  
کو بڑی یکساں فزاعی اور حسن کا دوزخ شور کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ غالب کا انداز کلام قرآن کے تمام فکری اجتماع  
اخترام کے باوجود زبان و اسلوب کی تابکاریوں سے یکسر پاک ہے اور اس میں کہیں کوئی الفاظ یا نہیں شکر کا جوتقل  
یا جوتہ براد کاٹوں کو گراں گزرتے لیکن آرد و دیوان غالب میں سخن کے چند اشارہ ضرور نقل آئیں گے جن میں یا تو ایسے  
الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو کسر العصرت ہیں اور دوسروں کو بے آہنگ بنا دیتے ہیں یا پھر شاعر ایسے الفاظ سے مرکب  
ہوا ہے کہ کسی جگہ سے شعر حسن اسلوب سے ملدی ہو کر رہ گیا ہے۔ دوسرا ذکر کو ایک مثال سے کہئے۔ غار میں قات  
کے کئی قصیدے ایسے ہیں جو کہ وہ کئی دنیا میں مہجرت کا حکم کہتے ہیں اور جن میں شروع سے آخر تک شعر کا لفظ  
میں تغزل کی دھن جاری و ملدی ہے یہ قصیدے اگرچہ غزل کے طور پر لائق کے قصیدوں کی زمین میں لکھے گئے  
ہو لیکن ان میں غالب نے اپنا اجتماعی انداز اور اپنی انفرادی شان کو بے ساختگی کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ ان کے



نہیں فارسی قصائد میں ایک قصیدہ نواب فقیر الدین حیدر دہلوی اور حاکم شاہ میں ہے جو مرقی کے اس قصیدہ پر کہا گیا ہے جس کا یہ مطلع اہل ذوق کی زبان پر ہے

ازدرد دوست چہ گویم برچہ سخاں رفتم

بمرد شوق آمدہ بودم ہر حسداں رفتم

غالب کے فارسی قصائد میں سے اگر صرف چار بہترین قصائد کا انتخاب کیا جائے تو ان میں سے ان کا یہ قصیدہ سرفہرست ہوگا۔ یہ سب سے زیادہ طویل قصیدہ ہوتا ہے نہ صرف قصیدہ کے اعتبار سے مثلاً کا رہے بلکہ شاعری کی وہ تمام خوبیاں اس میں سمٹ آئی ہیں جو شعر کے اصل اور فطری مزاج میں داخل ہیں۔ مطلع سے لے کر آخری شعر تک غزل کی نزاکت اور قصیدہ کی شوکت کا ایک خوشگوار امتزاج ہے جو ہر لاری کے ساتھ قائم ہے۔ یہ قصیدہ زعفران نگری بلاغت کے لحاظ سے نہایت مقام رکھتا ہے بلکہ اس کا ایک ایک شعر اس مرقی حسن کا کامیاب ترین نمونہ ہے جس کے بغیر شعر نہیں ہو سکتا۔

اں تو اس قصیدہ کی تشبیہ میں ایک شعر ہے۔

نگہم نقب بہ گنجینہ دہلوی نہ

خزودہ باو اہل دیا داکر زمیڈاں رفتم

بالکل یہی مفہوم ایک اردو شعر میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے

تھنگی میری نماں غنہ دل کی نقاب ہے خطر جیتے ہیں ارباب دیار میرے بعد

اس شعر میں نقاب کے سوا کوئی لفظ ایسا نہیں جو غیر فارس و عربیوں کے الفاظ کی ہے قرینہ ترتیب نے پورے

شعر کا ہنسا رنگ لگا دیا ہے۔ مرقی حسن کا ذوق رکھنے والے یہ محسوس کیے ہوتے بغیر نہیں دہلے کہ شعر میں حرکت کے بجائے جمود پیدا ہو گیا ہے اور وہ معنی دار ہوتے ہوئے بے جاں ہے۔

ایسے اشعار غالب کے اردو دیوان میں دو چار ہی نکلیں گے ورنہ ان کا اردو کلام بھی کیا غزل کیا قصیدہ اپنی

تہذیب و تہذیب کے ساتھ ساتھ سرگرم و متقی ہوتا ہے۔ وہ جس وقت غیر فارس و عربیوں کے الفاظ کا ترکیبوں یا انہی سے

انہی تشبیہوں اور استعاروں اور طبعوں سے کام لیتے ہیں اس وقت بھی ان کا کوئی شعر ترجمے سے متاثر نہیں ہوتا۔ ان

کے اشعار چھوٹی جگہوں میں جوں یا بڑی جگہوں میں آسانیوں میں بالکل معقول ہوں وہ کم سے

کم ایسے تو ہوتے ہی ہیں کہ نازک سنا داکر سازگار گانے یا سکس۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بخاری کی رائے بہت مناسب



جسکے غالب کا ہر مصرعہ کا رد باب ہوتا ہے اور ان کا یہ قول مبالغہ نہیں ہے کہ مرزا غالب کے لیے شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ ہر چہ شاعر کے اپنے اشعار ہی ہوتے ہیں مگر ترم یا فاضل جیو اور دوسرا پیر یا خیر سباز کے گانے جا سکیں۔ بات غلط نہ ہوگی۔ اسیر تہکان اور دواغ اور ان کے بعض تلافیہ کی خبر میں قرض گان گئی ہیں اس غالب اور تیرکی خبر میں نہیں گائی گئی ہیں مگر پھر آج کل ملی گانے جس طرح مقبول ہو رہے ہیں۔ تیر اور دواغ کی خبر میں بھی اتنی مقبول نہیں حالانکہ غلط گانے خاص موسیقی کی میزان پر جس قدر بھی پورے اترتے ہیں وہ اکثر خامیوں سے ہوتے ہیں اور کسی بحر یا چاند میں نہیں آتے۔

غالب کے کلام میں ہر آہنگ یا ترم ہوتا ہے وہ محض لفظی یا محلی نہیں ہوتا بلکہ بڑا استعداد اور فہم ہوتا ہے۔ ہر کویا محسوس ہوتا ہے کہ فکر و احساس کے ارتعاشات الفاظ کے صرف ارتعاشات میں ہونا ایک راگ پیدا کر رہے ہیں جو طبع بھی ہے اور نظر تک بھی اور جو ہا سے دل اور دماغ دونوں کے لیے راحت آفرین ہے۔ انیسویں غالب کے جدا کر کسی کی شاعری میں ملتی ہے تو وہ آفتاب ہیں۔ یوں تو صد و دسے چند اشعار اور دو چار غزلوں کے سوا غالب کا سلا اور دویوان آہنگ و ترم کی اس کوئی پر پورا اترتا ہے اور اس اعتبار سے ان کے اشعار کا انتخاب کرنا مشکل ہوگا۔ نظم فارسی میں تو خیر انتخاب کا سوال ہی شاید دو میان میں ضلایا جائے لیکن اردو میں بھی اشعار کا زیادہ حصہ ایسا ہے کہ ان کو انتخاب کرتے وقت چھوڑنا نہیں جا سکتا۔ پھر بھی مثال کے لیے تو کچھ غزلے منتخب کرنا ہی ہیں۔ پہلے کچھ فارسی اشعار لکھیں گے۔ کچھ غزلیں تو ایسی ملیں گی جو پوری کی پوری بریل یا ربانی ہیں۔ ان میں ایسی رچی ہوئی غزل ہوتی تھی کہ وہ سلاو سے سلاو اور پیچیدہ سے پیچیدہ تاروں کے ساتھ بے لگائی جاسکتی ہیں مثلاً وہ حسنزل جس کا مطلع یہ ہے :-

بسیا کہ قاعدۂ آسمان بگردانیم  
قضا پر گردشیں دہلی گراں بگردانیم

دو شعر اور دس لکھتے :-

اگر ز شمع شود وارو گیر نفعہ شمع  
و اگر ز شاہ رسد ارمغان بگردانیم



نیم شرم بہ یک شو و باہم آدریش  
ہے شوخیے کر رخ اخڑاں بگردانیم  
اس طرح وہ پوری غزل جس کا مطلع اور دو شعر یہ ہیں :-

نہ ہے باغ و بہار حبسِ فناں  
نہت چشم و چہرہ رخ رازِ داناں  
بہ صورت اوستا و لعلِ ریاں  
ہے سنِ قبلہ تا مہرِ باناں  
وصلتِ جاں تو آنا سزا ہے  
خیالتِ خاطر آشوبِ حیراناں  
بھولتی بھردوں سے غزل بھی بڑی حشر ہے -

تا ہم ز دل برد کا سہرا داتے  
بلا بلند سے کوتہ قبائے  
ز رشت کیسے آتش پرستے  
برسم گزارے زمزم سرائے  
ہوں مرگ ناگہ بیاستے  
ہوں جانی شیریں اندک دفائے

اسی غزل کے تحت چند متفرق اشعار کا انتخاب دیا جاتا ہے، لیکن جن غزلوں سے یہ اشعار لیے گئے ہیں، وہ  
پوری غزلیں موسیقی کے فن کی بھی مکمل فائدگی کرتی ہیں۔

نہرا دھستہ و رنجور در جہاں داری  
بچے ز غالب و رنجور دھستہ تھی یادگار

ز می بہ چہ ہمدیدن کسارہ می کردی  
بیا بہ خاک من و آرمیدم ہم ہنگر





برقے کہ جاننا سوختے دل از جہاں سر دیش بہیں  
 شوختے کہ غولہ نہ بختے دست از جہاں پاکش نہ  
 غریبم تا سازگار آمد دہلی فہیدہ مشمس  
 گرد تنگی حلقہ دامن آشتیاں نامیدیش

مگر انتخاب کی کوشش بحث ہے۔ غالب کا قریب قریب سارا کلام بالخصوص ان کا پورا فارسی کلام مع  
 غزلیات و قصائد انتخاب میں آجائے گا۔ اس لیے مزید مثالوں سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ پھر بھی ان کے اردو دیوان سے  
 بھی کچھ نمونے پیش کر دیتا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہاں بھی انگریزی غزلوں سے قطعاً ایک ایک پارے دھوئے کی تائید  
 کرتی ہیں اور جو غزلیں عربی کی ہیں ان پر سن جیٹ الکل پڑی نہیں پاتیں۔ ان کے بھی چیر و شمار سلاو و آراذ کے کاغذیں گونگی  
 دولت طلب دیتے ہیں۔ اس موقع پر ایک ایک دو دو شعر کی ترجمان لکھنا کرتے ہیں۔

دریوزہ سامانہا اے بے سوسالمان  
 از باد گریساں باد پرودہ عریان  
 ہجوم تاج حیرت عاجز عرض یک لفظاں ہے  
 خوشی دیش صد خیاں سے خس بد زان ہے

مری ہستی خصلت حیرت آباد تھا ہے  
 جسے کہتے ہیں نالودہ اسی عالم کا مختلف ہے

شوق ہے مسلمان طراز تاجی از باب مجز  
 ذہ سحر دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

کسی کو دے کے دل کوئی تو اسے نکالیں کہیں ہر  
 دہر جب دل ہی بیٹھے میں تو پھر زمیں زباں کہیں ہر



سختی ہم گل لادنہ غالی زاد ہے  
داغ دل بید رو گزر گاہ حیا ہے

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا  
جس دل پہ ناز تھا بے وہ دل نہیں رہا

دل ہی تو ہے دھگ دھشت دود سے بھرتا آئے کیوں  
رو نہیں گئے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

وہ فراق اور وہ وصال کہاں  
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

درد منت کش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

ابن اشعار پر غائر اور تہہ گیر نظر ڈالیے۔ کیا یہ احساس نہیں ہوتا کہ غالب کا اصل کتاپ دھرم ٹھری اجملو ہے اور نہ محض صوفی ترنم بلکہ ابن کا کمال یہ ہے کہ وہ دونوں کو ایسا مزاج بنا دیتے ہیں کہ اس کی تحلیل ناممکن ہے۔ اصوات و احساسات الفاظ و معانی ہم مل کر ایسا پیکر بن جاتے ہیں کہ اس کا تجزیہ کن کرنا اس کو توڑ پھونک دینا ہوگا۔ پھر نہ انکار کہ قدر باقی رہے گی نہ صوفی حسی ہی برقرار رہے گا۔

وقایع یا ناکل سم یا دھرتی مناسب جس کو عام زبان میں موسیقی کہتے ہیں شعر کا اساسی جزو ہے جس کے بغیر شعر شعر نہیں ہوتا۔ غالب کا قریب قریب سارا اُردو اور فارسی کلام اس کا شاہد ہے۔

شعر میں اور بہت سے نکات دلیری سموتے ہیں جو صوفی کیفیت اور صوفی حسی کو بطبع تر جانتے ہیں اور وہ ہم پہنچتے ہیں۔ ان میں بہت زیادہ عام تشبیہات و استعارات ہیں۔ کسی زبان کی شاعری تشبیہات و استعارات سے خالی نہیں اور فارسی اور اُردو شاعری میں قرآن کی بھر مار ہے۔ بعض تشبیہیں اور استعارے تو بار بار اتنا دہرائے



لگتے ہیں کہ وہ خسروہ جو لگے ہیں اور ان میں کوئی جان نہیں رہی۔ شعر کا اصل معنی قیفا ساوگ ہے۔ شعر جتنا ہی مادہ اور بے ساختہ ہو گا اتنا ہی صداقت سے محروم ہو گا اور اسی نسبت سے دانشیں ہر گاہ کیسے انسان نفس اور انسان زندگی کے حقائق اور مسائل تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے ساتھ پیدا ہو گئے اور تدریجاً ترس جاتے گئے ہیں جس کو قابل فہم بنانے کے لیے شاعر کو تشبیہات و استعارات اور دوسرے صنائع و بانی کے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ان ذرائع کے استعمال کا اصل مقصد یہ ہے کہ ماوی اور نظریہ خارجی اور باطنی حقائق کو زیادہ صوفیت کے ساتھ سمجھا یا جائے۔ جس میں تشبیہات و استعارات کو مقصود بالذات سمجھ لیا گیا ہو جس سے تخیل کی بے راہ روی شروع ہو جاتی ہے اور شعر نقول کی کارگری ہو کر رہ جاتا ہے اور اس میں کوئی نوک نہ باقی نہیں رہتی۔

قود کا یہ خیال جس کی ہم کو ان فطرتی تعلیمات نے بھی کی ہے صحیح نہیں ہے تشبیہات و استعارات اور صنائع و بدائع اور دھڑلے اور ان کے استعمال سے شاعر صافقت کے دور پر جاتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا نکتہ تو یہ ہے اور دہنا چاہئے کہ خیالات و افکار کا اثرات و محرکات ممکن۔ یہ تو سہ فیصد آدم ہیں۔ نظریہ یعنی ان وادوات قلب اور کیفیات ذہنی کو یہ سیکر ونا آورد ہے۔ کوئی معنی یا مفہوم ہمارے ذہن میں بے ساختہ پیدا ہو سکتا ہے لیکن اس کو صورت و دنیا محنت و کاوش کے بغیر ممکن نہیں یہ اور بات ہے کہ اگر اچھے چل کر یہ محنت و کاوش اس ملکہ ہی چلتے اور آورد میں بھی آدھ کی شای پیدا ہو جائے دنیا کے جیسے جیسے شاعروں کے کلام کی ایک سمت مخصوصیت یہی ہے کہ ان کے تشبیہات و استعارات میں بھی تخلیق بے ساختگی ہوتی ہے اور آدھ اور آورد کا فرق باقی نہیں رہتا۔

تفسیر یا استعارہ یا بیشتر دوسرے صنفیات بذاتِ اصل مبالغہ کے انواع ہیں۔ ہمارے قاری اور اردو کے شعرا خاص کر قاضی نے مبالغہ میں ایسی بے اعتدالیاں کی ہیں کہ آج مبالغہ ضعیف ہو کر رہ گیا ہے۔ ورنہ مبالغہ بذاتِ اصل اور ضمنیاب تکمیل کی ایسی ایجاد ہے جو موضوع کو بالیدگی بخش ہے جس کے ذریعے اشیا فروغ پا کر کچھ سے کچھ بوجھتی ہیں اور اپنے سے خوب تر ہوجاتی ہیں۔ لیکن مبالغہ میں بے اعتدال یا کسی قسم کی بد عنوانی مقیم تکمیل کی دلیل بنتی ہے۔ ایسا مبالغہ اشیا کو جمل سے جمل تر بنانے کے لئے بد نیست بنا دیتا ہے۔

شاہد کی اندرونی بہیرت جب کا دھڑکاؤ ختم نہیں ہے۔ وہ مختلف چیزوں کے درمیان کسی شہر کی خصوصیت کا پتہ لگاتی ہے اور اس کی بنا پر ایک کو دوسرے سے شائبہ قرار دیتی ہے۔ اسی کو شائبہ کہتے ہیں۔ اب اگر تخیل آنا شروع ہو کر خیریت اور شہرت کے درمیان جو دھڑکاؤ باقی ہے اس کو شاہد کی ذہنی کو ایک تصور کرنے کی تو یہ استعارہ ہو گا۔ بہر صورت شائبہ یا استعارہ کا مقصد یہ ہے کہ شکل اور چیز کے ساتھ ذہنی نہیں کرا جائے۔ بعد کو توافقی شکل لے



خاموشی نے خود پر ان کی پیروی میں امداد و شعرا نے اپنا ادبی قوت سے تشبیہات و استعارات ہی کو فن بنادیا اس کی شائیں ہی کم نہیں کہ اس فن نے ایسی بے اعتدالی کی شکل اختیار کر لی کہ شاعر بجائے اس کے کہ عید از فہم صافی کو مسل بنائیں خود جیتا ہی بہ کر رہ گئے ہیں۔

کسی منظر و فنی کار کا شعور جب جلد تری سطح پر پہنچ جاتا ہے تو وہ خود کوئی عید عاصدہ قیاس نہیں رہ جاتا بلکہ ایک استبعاد (PARADOX) پہنچے تضاد و مافوق فطرت نظر آنے لگتا ہے جو اس کی اصلیت ہے۔ اس منزل پر لوگ پہنچتے ہیں کہ حقیقت انہری نہیں ہے بلکہ خیال و رنج اور تہ و تہہ ہے اور اس کو سری اور مستقیم زبان میں بیان نہیں کیا جاسکتا اس کے اظہار کے لیے دروز و ظلمات و کلا جوتے ہیں۔ بقول غالب

بر چہند ہو مشاہدہ حق کی گفت گو

بقی نہیں ہے بارہ و ساغر کے بغیر

غالب کو وجود کی اس جدلیاتی اہمیت کا انداز لگ تھا۔ ان کی رفیع و عمیق فکر حقیقت کے تمام پہلو و محمول اور اس کی تمام انہوں کو سمجھ جاتی تھی اور ان کا فطرت نگاہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے مرزوں و افکار و محاورات اور تشبیہات و استعارات تراش دیتا تھا جن کا یہ عالم ہوتا تھا کہ بار بار مطالعہ کے بعد بھی ان کی قدرت باقی رہتی تھی۔ اس سے انکار نہیں کہ غالب کا تخلیق کون کس امداد کے حدود سے بہت دور چلا جاتا ہے اور ان کی فطرت نگاہوں میں غریبیت پیدا ہوتی ہے ان کے تشبیہات و استعارات عید از قیاس اور دُور از فکر ہر جگہ ہیں لیکن عام طور سے عید عاصدہ قیاس غالب کی فطرت نگاہوں میں اور تشبیہات و استعارات ہا محرم ناگزیر ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صافی نے اپنے لیے الفاظ کا یہی راسخ خود تراش لیا ہے غالب اور فروغ کے ان دوسرے استاد کے کلام کا پہلو بہ پہلو مطالعہ کیے جو تشبیہات و استعارات اور دیگر اسلوبی تعلقات کے بغیر ایک تہم آگے نہیں بڑھ سکتے تو جوابات واضح طور پر سامنے آتی ہیں کہ اگر استاد کی شاعری میں یہ تعلقات خصوصاً بالذات معلوم ہوتے ہیں اور غالب کی شاعری میں یہ اظہار کے لیے لازمی تھے ہیں۔ جو بات دوسروں کے یہاں طول کلام معلوم ہوتی ہے وہ غالب کے یہاں میں بلاغت ہے اور شعر کے لازمی تنجیمی جزو کا علم رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک سہنڈ میں یہ دو اشعار پر غور کیجئے۔ پہلا شعر واضح کا ہے۔ دوسرا شعر غالب کا ہے۔

مرا سینہ مشرق آفتاب داغ و چراغ کا

مروج بیج مشرق کا ہے اپنے گلہاں کا



شعر مشور ہے مگر بات کسی گن ہے وہ کیا ہے اور کتنی ہے و کنا موت اس قدر ہے کہ میرے سینے میں ہجر کا  
 داغ ہے اور میرا گہاں چاک ہے۔ اتنی ہی بات کے لیے تکلفات کا یہ اہتمام و تہیہ ہے کہ شعر میں نہ کوئی تہیہ و تکلیف  
 نہ کوئی بلاغت پیدا ہو سکی اور نہ ہی شعر خاص صنعت گری کا اچھا نمونہ بن سکا۔  
 اب غالب کا شعر سنئیے :-

شائش گر ہے زائد اس قدر جس داغ و غزل کا

وہ کہ گدستہ ہے ہم بے غوروں کے طاق نیاس کا

ناہ جس داغ کی اس قدر تعریف کر رہا ہے اور جس کے تصور میں وہ گئی ہے وہ ایسا دلہا داغ نہیں ہے۔  
 وہ داغ جنت ہے جس کے حدود اور لہجہ کا اعلان نہیں کیا جاسکتا ہے۔ شاعر کہتا ہے اگر اس کو کیا کیجئے کہ زور و رفت  
 دیاؤں کے لیے وہ ایک مختصر گدستہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ بھی ایسا گدستہ جو ایسی ہر گاہ ہوا جس کو  
 طاق نیاس میں ڈال کر بھلا دیا گیا ہو۔ اس شعر میں اگر ایک لفظ کم کر دیا جائے یا کوئی لفظ بدل دیا جائے تو سبزی غزل کا  
 اندیشہ ہے۔

غالب کے ارد و دیوان سب ایک طرف نے غیب کر کے چٹی کیے جاتے ہیں جن سے اس کی اخراجی قوت کا  
 اندازہ ہوتا ہے اور جن کی بنا پر غالب ارد و شاعروں میں مخمور اور مہماؤں نظر آتے ہیں سب سے پہلے وہی شعر ملاحظہ  
 ہو جو دیوان غالب کے ہر شعر میں روح ہمنامہ کی حیثیت رکھتا ہے یعنی  
 نقش فریادی ہے کسی کی شوقی قفس پر کا

کافری ہے ہر بین ہر سبک تصور کا

باوی اعظم میں شکر جو خوبی ایک صاحب ذوق کو شاذ کرتی ہے وہ شائبات نقل کا اہتمام ہے۔ دوسرے  
 مصرعوں میں تمجیح ہے اور تمجیح ہی سے صنعت حسن تحلیل پیدا کی گئی ہے۔ تبلیغ تحقیق سے معلوم کی جاسکتی ہے لیکن پہلا شعر  
 خاص استعارہ ہے جو شعر کے بنیادی معلوم کو ناقابل یافت بنائے ہوئے ہے۔ اگر شاعر خود شعر کا مطلب نہ سمجھ گیا ہوتا  
 تو ہر آج تک قیاس آرائیوں میں بھگتے رہتے اور اصلیت تک نہ پہنچ پاتے لیکن شاعر کی تشریح کے بعد تسلیم کرنا پڑتا  
 ہے کہ اس خیال کو اس سے بہتر پیرایہ میں نہیں بیان کیا جاسکتا تھا اور اس کے لیے اس استعارہ کے بغیر کام نہیں چل  
 سکتا تھا۔ مسلسل اور مربوط تشبیہ کی ایک اچھوتی شکل یہ شعر ہے۔



مینائے سے ہے سرور نشاطِ بہار سے

بالِ تمددِ جلوتِ سرجِ شہراب ہے

حال سے تعالِ غالب کے اشعار کی جتنی تشریحیں بری نظر سے گزری ہیں ان میں یا تو اس شعر کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے یا محض سرائی جیسے شاعرین نے اس کی شرح لکھتے ہوئے ناواقفیت اور مجز فہم کا احترام کیا ہے۔ محض شعر کی تشریح کرتے ہوئے آخر میں قائلہ اعلیٰ لکھ کر رہ گئے ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ پروفیسر محمد امرفغان نے دیوانِ غالب (نسخہ محمدی) کا جو نسخہ مرتب کیا ہے اور جو جولائی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں شعرِ ذیلِ حاشیہ میں پہلے مصرعہ کو منسلق کرتے ہوئے قیاسی طور پر یہ اصلاح یا ترمیم تجویز کی گئی ہے

مینائے سے ہے سرور نشاطِ بہار سے

جس نے پہلے شعر کو فارسی جہنمی بنا دیا ہے۔ حاشیہ میں عرضِ صاحب اور پروفیسر شیرانی کی ترمیم کا بھول دیا گیا ہے جس کی صورت یوں ہے۔

مینائے سے ہے سرور نشاطِ بہار سے

اس سے بھی کام نہیں چلتا اور شعر پر دستور بعید از فہم رہ جاتا ہے۔ ان سب غالب شناسوں نے بڑی احمقانہ کے ساتھ بالِ تمدد پر توجہ دینے سے پہلو تھم کیا ہے، حالانکہ اس مرکب کو کہ بغیر شعر کبھی مر نہیں آسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ شعر میں بالِ تمدد اپنے لغوی مضموم میں نہیں استعمال کیا گیا ہے بلکہ اس کے معنی تمدد یا بیکر کے ہلکا ہلکا کھینچنے ہیں۔ بالِ تمدد فارسی کا ایک پڑانا محاورہ ہے اور اس کے معنی ایسے بادل کے ہیں جو پکڑ رہا پھاڑتا تیرنے کے پڑوں کی طرح تمدد رہ جاوے۔ عربی کے پڑانے محاورے میں ایسے بادل کے لیے ’اہل‘ استعمال کیا گیا ہے۔ ایسا بادل برسے بغیر نہیں رہتا، غیاثِ الحفقات اور نفاذی کے دوسرے کلاسیکی نقات میں بالِ تمدد اس مخصوص معنی میں مل جاتے گا۔ شعر میں دراصل کیفیتِ ہمارا کا نشان بیان کیا گیا ہے اور شعور کی ایک چند سطح سے اس کا وہی مضموم ہے جو ایک ادنیٰ سطح سے دیا من غیر آبادی کے اس شعر کا ہے۔

مگر غضب کی ہوا میں مستی ہے

کہیں پر کسی ہے آسمان سے آج

جو شہ جبار نے مارے باغ میں جو سرور آگیں کیفیت پیدا کر دی ہے اس کو غالب تشبیہات میں جوڑ بیان کرتے ہیں۔۔۔



سودھانے سے ہے۔ ہمارا مست کروینے والی کیفیت سے ہے اور آسمان پر لہرائی ہوئی خوشگوار گستاخ  
شراب کے چڑھتے ہوئے نشہ کا نتیجہ ہے۔

چند غزلوں اور کچھ اشعار کو مستثنیٰ کر کے جو سہل المتیع کا حکم رکھتے ہیں غالب کے اردو دیوان میں ایسے  
اشعار کم نکلیں گے جن میں کسی نہ کسی عنوان سے تشبیہات یا استعارات یا ان کے شائبے نہ پائے جاتے ہوں۔ مثال کے  
طور پر کچھ اشعار سنئیے:-

لاؤ دلا دلت جانہائے تنہائی نہ پرچہ  
صبح کرنا شام کا لالہ ہے جوئے شیر کا

آجھی دام شنیدن میں قدر چاہے کھیلے  
دعا صحت ہے اپنے عام دستہ پر کا

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار  
صرا کر ہر تنہا چہ شہم صودھا

دل حریت زدہ تھا دیوہ لذت درد  
لام یاروں کا بہ قدر لب و دندان نکلا

میں قدر غلک ہوا ہے دل بھڑی یاد پ  
نقش ہر ذرہ سوزائے سیاہی ہل نکلا

دل گذر گاہ خیال مئے و ساغر ہی میں  
گزنس جاوہ سر منزلِ مقصدی نہ ہوا



ہیں بلکہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے  
ہر گوشہ بھلا ہے سر شیشہ باز کا

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو  
توڑا جو تو نے آئینہ قشال دار کا

یک قدم دشت سے درس دفتر سماں گھلا  
بادہ اجڑائے دو عالم دشت کا شیراز تھا

ہے کہاں کشت کا دوسرا قدم بیا رب  
بہم نے دشت اسکاں کو ایک نقش پایا

خانے پائے خستہاں ہے بہار اگر ہے ہیں  
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

بڑھتے شش جہت در آئینہ باز ہے  
یاں آفتاب ناقص و کامل خسیں رہا

بزم قدر سے عیش تنہا زد کہ کر رنگ  
صید ز دام جہت ہے اس دام گاہ کا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی  
چمنہ زندگار ہے آئینہ باد بہاری کا





مغنیں برہم کرے ہے گنجد بازخیال  
میں ورق گردانی نیرنگ یکبخت خانہ ہم

بادِ جود یک جہاں جنگار پیدائی نہیں  
ہیں چراغِ شبستانِ دل پر دانہ ہم

اہلِ پینش کو ہے طوفانِ حوادث کتب  
لغز و موج کم از سیلِ استاد نہیں

دیر و موسم آئینہ تکرار کست  
دانا دلِ شوق تراشے ہے پناہیں

نزدیک سے ہے دامنِ گل  
صفت کب بندِ قبا باندھتے ہیں

ہے رمانی چیلہ جوئے ترک تنہائی نہیں  
درد کیا موجِ نفس زخمیرِ صوائی نہیں

قید میں یعقوب نے لگو نہ یوسف کی خبر  
لیکن آٹھیں روزی دیا از ندانِ پریش

از ہر تابِ دردِ دل و دل ہے آئینہ  
طولی کو کششِ جوت سے محال ہے آئینہ



دشت درد بیکس بے اثر اس قدر نہیں  
دشتِ عمر خیز کو نالہ نارسا بھر

میری ہستی فضائے ہجرت آباد تھا ہے  
جیسے کہتے ہیں نالہ وہ اس عالم کا تھا ہے

پیکرِ عشاق ساز طالع ناساز ہے  
نالہ گرواگر دشمن سیارہ کی آواز ہے

رفقہ عرقِ دلِ رنہ اضطراب ہے  
اس سال کے حجاب کو برقِ آفتاب ہے

خیالِ مرگ کب نکلیں دلِ آزدہ کو جیسے  
مرے دامِ قنایں ہے اک حیدرِ بوں وہ بھی

ہے دلِ شوریدہ غالبِ ظلم بیچ و باب  
رہم کر اپنی تشا پر کر کس مشکل میں ہے

لکھا کشائے ہستی سے کہے کیا سی آرزوی  
ہوئی زخمی سرِ مریخِ آب کو فرصتِ دانی کی

جہنم میں کس کے یہ برہم ہوئی ہے بزمِ نشاط  
کو پرگ برگ چمنِ شیشہ ریزہ میں ہے



دیدارِ باوہِ حوسد ساقی نگاہِ مست  
بزمِ خیالِ میکرہ ہے خروشن ہے

طعنے خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے جنگ  
یہ جنتِ نگاہِ وہ فردوسِ گمشدہ ہے

خوشا اقبالِ رنجوریِ حیات کو تم آئے ہو  
فردوخِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

یہ طوفانِ گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہا  
شعاعِ آفتابِ صبحِ عشرتِ بستر ہے

قدو کیسو میں قیس و کو حکن کی آرزو ہے  
جہاں ہم ہیں وہاں دار و درمن کی آرزو ہے

نعتِ بگر سے ہے رگِ برِ غارِ شاخِ گل  
تا چند ہفتابِ انِ صحرایہ کوئی

مستیِ بذوقِ غفلتِ سالی چاک ہے  
سجِ شرابِ یکِ خرہِ خوابِ جاگ ہے

حسرت نے لادکھائی بزمِ خیال میں  
گلدستہِ نگاہِ سویدا کیسے ہے



مسلوم ہوا حال شہیدان گزشتہ  
تین ستم آئینہ تصویرِ مفاہ

پردہ از چہشِ رنگی گلزار بہتے  
خونِ ہر قفسِ دل میں لے ذوقِ پریشان

دلِ پھر طوافِ کوٹے طاعت کو جائے ہے  
پندار کا صم کدہ دیراں کیے ہوئے

تا کہا اے آگہی رنگِ ستا باطن  
چشمِ داگردیدہ آنکھیں و دواں میں ہے

ہوش میں ابھی پیش کی گئی ہیں وہ سب غالب کے اُرد و کلام سے لی گئی ہیں۔ میں نے قصداً انہی کلام سے نونے دینے سے اجتناب کیا ہے۔ غالب کے نوبہ نو اور نادر اشعار و تشبیہات و استعارات اور ان کی اجتہادی قزاقی کی نقلی ترکیبیں کچھ ان کے اہل و عیال میں بھی عام اور نفاذ کی ہیں مگر ہم ان میں ایسی غرابیت اور وقتِ صوص کرتے ہیں کہ بے لافقت ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے۔ سن کا فارسی کلام پڑھتے وقت اس قسم کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اس کے دو اسباب ہیں۔ اول تو یہ کہ مشرق میں سے متاخرین ملک پہنچتے پہنچتے فارسی شاعری اچھی طرح باطن اور تربیت یافتہ ہو چکی تھی۔ تنوع اور حق کے اعتبار سے اس میں جامعیت اور ہم گیری یا اچلی تھی اور اس کے اسالیب و صورتِ طرح کے تاثرات و افکار اور جذبات و تعلقات کو بدوجہ احسن بنا کر دینے کی قدرت رکھتے تھے۔ غالب نے فارسی کے اساتذہ کی زبان اور ان کے فنی رموز و علامات سے انحراف کرتے ہوئے اختیار لیا ہے۔ اس کا دوسرا سبب یہ تھا کہ فارسی شاعری کی زبان بلاغ و زائعاتی سے محروم زبان تھی لہذا اس میں اس ستم کے فارسی از آجنگ جملات کی گہنا نش نہیں تھی جن کو ہم اجمال طور پر تہیہ لیتے ہیں کہیں گے اور جن کو غور و غلبت نے ہمارا بجا دنی بیول کیا ہے اور جن سے اس کا اندوہ و دلچسپی بھرا ہوا ہے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ غالب اپنے مجرور اور دواں کو اپنے لیے بے رنگ اور ننگ سمجھتے تھے اور اپنے فارسی کلام کو نقشِ لائے رنگ، رنگِ تصور رکھتے تھے۔ ان کو ارمان اور امر ارتقا کو ٹھونکے



از گلستانِ مجسم ہیں اور ان کو ڈر تھا کہ کہیں وہ واقعی مولیٰ ہندوستان ہو کر ذرہ جانیں۔ اس لیے وہ اپنے فارسی کلام میں سنبھلے سنبھلے نظر آتے ہیں۔

لیکن غالب غور صاحب ہنر تھے اور فطرت نے ان کو تخلیق توانا بنا دیا تھا کہ ان کی قلمی اور اخلاقی زندگی میں جب سستیاں طرقتیں کو از سر نو استعمال کرتا ہے تو ان میں اپنی انفرادی شان پیدا کر لیتا ہے اور اس کا عقیدہ ہی اجتماع کا انفرادیہ ہونا غالب بھی اپنی فارسی شاعری میں شاہیر کے اصول و روایات اور اسالیب و علامات سے انحراف کیے بغیر مضبوط عمارت نظر آتے ہیں۔ ان کے فارسی اشعار پر ان کی اپنی مہر جوتی ہے اور ان پر کسی دوسرے شاعر کے کلام کا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ اردو میں غالب پامال اور فرسودہ محاورات اور عام بولی چال سے اجتناب کرتے تھے اور لفظوں اور نقطوں کا نئی ترکیبوں سے اپنے کو متاز رکھتے تھے لیکن جب کبھی وہ عام الفاظ و محاورات نظم یا شعر میں استعمال کرتے تھے تو ان میں ایک جمالیاتی کیفیت اور نثری شادیت پیدا کر لیتے تھے جس کی وجہ سے عورت اور فرسودگی ندرت اور تازگی میں بدل جاتی تھی۔ ثبوت میں ان کے سارے اردو خطوط اور وہ نثریں اور اشعار چنی کیے جا سکتے ہیں جو سادگی اور بے تکلفی میں اپنا جوا ب نہیں رکھتے مگر جو ہر حال میں نئے اشعاروں کے حامل ہیں اور جن کے ہمہ اور تیر صاف بتاتے ہیں کہ وہ غالب ہی کے لکھے ہوئے ہیں اور غالب کے سوا ایسے اشعار کوئی دوسرا نہیں کہہ سکتا تھا۔

غالبیات کے ماہرین مسلسل کہتے آتے ہیں کہ غالب کے اشعار چلو دار ہوتے ہیں اور وہ تشریح کے ساتھ شائیں بھی دیتے رہے ہیں۔ ہم یہاں ان میں سے چند اشعار دہراتے ہیں۔ تشریح اس لیے نہیں کریں گے کہ حال اور اکثر مجتہزی سے آپ تنگ بھی اس کی تشریح کر چکے ہیں۔ ان میں ہر شعر کا مرکزی تصور تو ایک ہی ہے لیکن اس تصور تک پہنچنے کے پہلو ایک سے مختلف ہیں۔

غیر پیر مگ کھلنے آج ہم نے اپنا دل  
خون کیا ہوا دیکھا مگر کیا ہوا پایا

نہیں معلوم کس کا ہوا پان ہوا ہنگ  
قیامت ہے سرنگ آلودہ ہناتیری مڑھان کا



میں اے قدرت گر جس دفا میں  
شکست قیمت دل کی صدا کیا

میں نے جنوں پہ لا کہیں میں اسد  
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

کون ہوتا ہے حریف مے مردانہ عشق  
ہے مگر رب ساقی پہ صلا میسے بعد

تو ہے مرد قنات سے اک فتاد آدم  
قیامت کے قہر کو کم دیکھتے ہیں  
تجربہ اشعار کی چو در یوں کیوں میں بھی غالب کے ماہرین کو توجہ کی دعوت دیتا ہوں۔ شاعرین کی نظر ان  
اشعار کو چھوڑ گئی ہے۔ میں فی الحال ان کی تشریح نہیں کروں گا۔  
کیا وہ ضرور کی حشر دان تھی  
بہشت کی میں مرا جھلا نہ ہوا

بروز نئے شش جہت در آئینہ باز ہے  
یاں اختیار ناقص و کامل نہیں رہا

اسب عیسٰی کی جنبش کرتی ہے گلوہ زبان  
قیامت کش مہل تباں کا خواب بن گیا ہے  
غالب نے اپنے انداز بیان کو شفتہ بیان کیا ہے یہ ہم ان کی شیوہ بیان ہے۔ لیکن مگر انہیں کی کہی  
ہوئی بات میں لیا ہے تو یہ ہم انہیں سے گا کہ ان کی آشفٹہ بیان میں ایک ایسا قریب ہوتا ہے جو اس کا لازمی



تو کبھی جزو ہے اور جو صرف غالب کے ساتھ مخصوص ہے

غالب کی نکتہ سرائی کی ایک خاص ادا ان کا طنز یا طنز پر مبنی ہے غالب کے خاص اور اردو و ایرانی میں ایسے اشعار کافی تعداد میں مل جائیں گے جو خاص طنز یا طنز کے خائبہ کے حامل ہیں۔ غالب کے ساتھ شفقت رکھنے والے اپنے اپنے حافظہ یا مطالعہ سے خائیں نکالنا کر سکتے ہیں۔ جو بات یاد رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اردو میں صرف دوست اعرایہ ہوتے ہیں جنہوں نے طنز کو ادبی اسلحہ سے بلند کر کے ایک رفیع مقام پر پہنچایا ہے۔ درد ہمدی شاعری کبھی طنز و طعنت سے خالی نہیں رہی ہے۔ ہمدی مراد تیر اور غالب سے ہے۔ دونوں نے طنز کو بڑا نازک اور لطیف فن بنا دیا ہے اگرچہ دونوں کے طنز میں فرق ہے۔ دردوں کے مختلف مزاج کا آئینہ دار ہے۔ تیر کے طنز میں ایک نکلن گیسٹہ درد مندی ایک گھٹاوٹ ایک گڑبختی اور غری ہوتی ہے جو ان کی ہندوستانی ماورائیت (EMOTIONAL TRANSCENDENTALISM) کا تجربہ ہے۔ غالب کا طنز ان کی انصافی دردوں میں پودا لگاتا کرتا ہے اور اس میں اکثر شوق کی حد تک بڑھی ہوئی ہشیاری اور ہمدی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کہ طنز ہندوستانی تاثیر کی مخلوق ہے اور ہمارے دلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ غالب کا طنز عموماً عقل اور لگاؤ کا پتہ دیتا ہے اور ہماری انسانی قوتوں کو بچھڑاتا ہے۔

اسی طرح غالب نے حس اور عشق کے اختلاط کے بعض ایسے مواقع اور معاملات کو زبان و بیان سے سنجیدہ اور متین بنا دیا ہے جو دوسرے اردو شاعروں کے یہاں قبیل اور بازاری ہر کرہ گئے ہیں غالب کا یہ شعر بہت مشہور ہے

میںد اس کی ہے دماغ اس کا ہے راقی اس کی ہیں

تیری ذہنیوں جس کے بازو پر پریشان ہو گئیں

آؤدی کا ایک دوسرا شعر ہے جو زیادہ مشہور نہیں ہے۔

ابھی آتی ہے بڑبازش سے اس کی ذہن مشکیں کی

ہمدی دید کو خواب نہ لینا عمار بہتر ہے

منہرجہ بالا دونوں شعر پہلے چھپ چکے ہیں۔ ایک اور شعر نیچے

جزو نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر

داس کو اس کے آج حریفانہ کیچنے



اور فارسی کے یہ دو اشعار خورشید سے پڑھنے اور سمجھنے کے لائق ہیں  
نجیم مشرق بہ یک سو وہ باہم آوریم  
ہر خوشی کو رخ آہستہ راں بگردانیم

نے کف گرفت سادہ دلت لب دہودہ بوس

ورنہ خوشی وصال بہ بجزاں برابر است

غالب کے تشبیہات و استعارات سے مفصل بحث کی جا چکی ہے اور کافی مثالیں دی جا چکی ہیں۔ دو مثالیں اور دی جاتی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تشبیہات و استعارات کو وہ کس بلاغت اور کیسی ہنرمندی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روزِ تخلیق اور اسرارِ فطرت کے اظہار کے لیے ان کی فکری کارگاہ میں اسالیب اور بہ خود بخود چلے جاتے تھے۔ تخلیق کائنات سے متعلق یہ شعر ہماری فکر کے لیے ایک مستقل دعوت ہے

باد و چو یک جہاں ہنگام پر پڑائی نہیں      ہیں سپہ افغان شہستان دل پر دان ہم  
اور غالب کا یہ شعر تو فکر و اظہار کا ایک مجزہ ہے۔

جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا      اسے دلتے نال لبِ خرمیں نوا سے گل

شاعر حسن و عشق کا دماغ بھرا رہا ہے۔ حسن اور عشق یکساں جٹکائے آزار ہیں۔ پہل ہی نالہ نہیں کر رہا ہے۔ کلاب کا پہل ہی اپنے لبِ خرمیں نوا سے نالہ ہی کر رہا ہے۔ لیکن اس کا نالہ رنگ کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے اور ہم دھوکا کھا رہے ہیں۔ سادہ کے تاثر کو باہر کے تاثر میں تبدیل کر دینا صورت اور رنگ میں جوئیت پالینا بڑا شدید تخیل اور فطری ذراک بھیرت چاہتا ہے۔ یہ سعادت کچھ مغربی فنکاروں ہی کے حصہ میں آئی ہے۔

غالب کے اسلوب کی چند نمایاں اور مستقل خصوصیات کا جائزہ لیا جا چکا ہے لیکن پھر بھی اساطیر نہیں کیا جاسکا۔

فکر و تخیل کی رسائی اور گیرائی کی طرح شاعر کی اسلوب اختراع اور جوت طرازی بھی ایک نمط ہے اور اس ہے۔ ان کے اشعار میں جہاں جو لفظ آتا ہے وہ واقعی تنبیہ و مسخر کا طعنے جوتا ہے۔

غالب بعض اوقات کوئی معمولی لفظ ایسے غیر معمولی اور غیر متوقع طور پر لے آتے ہیں کہ اس کے استعمال سے شعر کا مغربی کیفیت بڑھ جاتا ہے اور وہی شعر کی اصلی روح برتا ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل شعر میں حرفِ تازی جو روزِ توتہ





اور عام اہل چال کا فلسفہ ہے۔

قری کف خاکستر و بیکل قفس رنگ

اے نالہ نشانی جگر سوختہ محب ہے

مکنت خاکستر اور قفس رنگ دونوں بیخ استعارے ہیں اور دونوں وجود کے اختصار اور تنگی کا احساس دلانے کے لیے لائے گئے ہیں۔ ایسے مختصر اور تنگ وجود کا کوئی نشان ہوتا تو کوئی اعتبار مکین قری اور بیکل کے نالے نے دونوں کے جگر سوختہ کی خبر دے کر ہم کو دونوں کے وجود کا اعتبار تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس شعر میں سلاحتی آنے کی اشاریت کامرہوں ہے۔ جو شے ہستی کی اصل حقیقت اور اس کی دلیل ہے اس کو مخاطب کر کے پوچھا گیا ہے کہ ہستی کی دلیل آخر کیا ہے۔ استفسار ہی میں جواب موجود ہے۔ ایک دوسرے شعر میں بھی آئے اس طرح احتمال کیا گیا ہے۔

کہ کے ہوں بار خاطر گر جدا ہو جائے

بے تکلف اے شرادہ جتہ کیا ہو جائے

شرادہ جتہ کے صوا اگر کچھ بھی ہوئے تو کہیں دکھیں کسی دکھیں دوسرے وجود کے لیے بار خاطر ہونا لازمی ہوگا۔ غالب کے اسلوب میں بہت سی خصوصیتیں ایسی ہیں جو بالکل منفرد ہیں اور جن کو کوئی تنزیہی نہیں دیا جاسکتا۔ یا تو کچھ کوبہ وہ ادائیں ہیں جن کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ غالب کا اسلوب نظام قدرت کی طرح اپنے دوز و سرار کو یکبارگی افشا ہونے نہیں دیتا۔ بار بار لگن اور عورت کے ساتھ مطالعہ کرنے ہی سے ہم تجزیہ کی ان ملک پہنچ سکتے ہیں۔ غالب کا کلام بہت ہی تازگی اپنے اندر رکھتا ہے اور ہم اس کے مطالعہ سے کبھی لگاتے نہیں۔ غالب کے اشعار جب جب پڑھیں گے گالں میں جیشہ نہ نئے نہ عالم دکھائی دیں گے۔



## غالب اور ہم

ہیں مری نشاط تصور تھے نغمہ سنج  
میں حلایب گھٹن نا آفریدہ ہوں

عظیم شخصیتوں کی زندگی میں ہیں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو وہ کوئی کام نہیں دیکھتے لیکن جو اپنی مثال آپ  
اس کے توسط سے ہر کاموں کے لیے مشورت ثابت ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے وجود سے دوسروں کے دل وہاں میں گنتی  
اکتساب کا دوا پیدا ہوتا ہے۔ میں ان شخصیتوں کی عظمت یہ ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں کو کچھ کر کے یاد گار کر دیتے ہیں کہ ان کی تعریف  
ہیں اور ان کے تخلیقی جذبہ کو بے ساختہ اجماع میں اور اپنے کچھ ذکر سکے کا گناہ ادا کریں۔

کچھ بڑے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خود اپنی جگہ ایک قوت ہوتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے موثر نہیں ہوتے۔ اس  
کاسبب یا تو یہ ہوتا ہے کہ ان مددگار شخصیتوں سے جو شایس پیدا ہوتی ہیں ان کا دائرہ اثر تنگ ہوتا ہے اور وہ ان شخصیتوں کے  
گہ جالی کر رہ جاتی ہیں۔ یا پھر اگر وہ شایس مذہب کی پہنچ میں ہیں تو وہ اتنی تیز اور گرم ہوتی ہیں کہ دوسرے ان کی تاب نہیں  
لا سکتے اور اپنی خواہش اور کوشش کے باوجود وہ ان جیسے خود غم شخصیتوں کے اثرات اپنے اندر جذب نہیں کر پاتے۔  
لیکن بڑے لوگوں کی ایک قسم یہی ہے۔ اس قسم کے لوگ جی جیتے اور موثر شخصیت کے ملک ہوتے ہیں۔

وہ خود تو اپنی جگہ تخلیق و اختراع تو نالہ دیکھتے ہیں لیکن ان کے اندر یہ قوت بھی ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے معاصرین کی  
کامیابیوں کو نئے انداز سے متاثر کریں بلکہ نئے جہتوں میں ہر زمانہ میں جو نیا نیا جو ان کی پہنچ یا دکانداروں کے اثر سے  
فکر و بصیرت کو نئی جگہ دیتے رہیں اور اختراع و اکتساب کے میدان میں نئے امکانات اور نئی سمتوں کا احساس پیدا کرتے  
رہیں۔ ان عظیم شخصیتوں کو ہر جگہ کا جدید زمین اپنا جہم و جہم ہم پاتا ہے اور ہر نوجوان صاحب فکر و عمل ان کی طرف  
اپنے کچھ چاہیے محسوس کرتا ہے۔ غالب کا کہنا کہ اسی قسمی برادری میں ہے میں اور اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔



اکابر ذوق و فطرت و شایستگی و فن کو اپنے زمانہ سے اکثر گرفتاری اور تنہا شناسی کا شکار رہا ہے۔ مقررہ طے سے کر آج تک جو لوگ نثر کی اعتبار سے پیش رفت رہے ہیں ان کو صرف اپنے زمانہ کے لوگوں سے شکایت رہی ہے بلکہ ان میں ایسوں کی تعداد کم نہیں جو ستائے گئے ہیں اور جن کو اپنی نثر کی بدولت جان کی قربانی دینا پڑی ہے۔ انیسویں صدی کے رومانی دور میں ورنڈ سورن جو جیسا مطلق تکلف و دماغ رکھنے والا اپنے صنف کی مادیت اور فنی صحت جیونی زبردستی کا نشانہ ہو گیا ہے۔ اس کے خیال میں سودا اگر آزاد نہ ہو، اور نہ جواز میں دینے والے ہمارے قوتوں کو ضائع کر دیا ہے اور ہم کو اس قابل نہیں دیکھا ہے کہ ہم ان پر کترن کو عسوس کر سکیں جو قدرت کے ہمارے لیے مہیا کی ہیں۔ دوسری رومانی فنل کا مشہور نظریہ شاعری اپنے زمانے سے بہت آگے تھا۔ یہی نہیں بلکہ سورن و انیسویں صدی کے تمام نثر نویس اپنے ہی زمانہ میں دیکھ لینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے صنف سے اس قدر پر غرور اور متعجب ہو کر خود کو جلا وطن کر لیا اور اٹھارہویں صدی کے ادیبوں میں شہاب میں مرا اور جب تک وہ زندہ رہا اس کا وطن اس کا وطن و صنعت کا نشانہ بنائے رہا۔ شیلی فرخند آزادی اور محبت کا پیغمبر تھا۔

غالب کو بھی زمانہ اور زمانہ سے شکایت رہی ہے بلکہ ان کے خطوط اور بعض اردو ادیبوں کا اس بارے سے حریف ہوتا ہے۔ عام خیال یہ تھا کہ ان کا اردو کلام نثر کے اعتبار سے پچھلے اور اسلوب کے لحاظ سے غیر فاضل اور دودار کا رہتا ہے۔ خود غالب کو احساس تھا کہ ان کا کلام مشکل ہے اور وہ کوئی مشکل و گزیر شکل کی نگارش میں مبتلا تھے۔ اسی لیے ان کی فاضل جی غیر آزادی جیسے مضمون کے مشورہ اور تعاون سے وہ انتخاب مرتب ہوا جس کو سورن جی نے نکالنا تھا۔ یہ چلے تو ان کا خیال سمجھا جاتا رہا۔ یہ اپنے صنف کے بہت معزز اور ممتاز لوگ تھے اور غالب کی صلاحیتوں کے مستحق تھے۔ اور صدق دل سے چاہتے تھے کہ غالب کے نثری اجتہادات اور اسلوبی اختراعات کم سے کم ادیبان علم و فن میں کثیر سے کثیر تعداد کے لیے قابل فہم ہوں اور وہ ان سے فہم حاصل کر سکیں۔

لوگ کہہ گئے وہ لوگوں کا بھی تھا جو بالکل ہستیوں سے صرف اس لیے حصار پر فاش رکھتے ہیں کہ خود اپنے اندر کوئی نیا پیدا کر کے اور جو اچھوں کو بڑا کہتے ہیں کہ نہ وہ ایسا کہنے پر اس طرح فخر و مجبور ہیں جس طرح مجبور ہو کر کہنے پر۔ یہ لوگ غالب کی شاعری کو مہترما سمجھ لیتے تھے۔ ان کی نثر میں خود تھا اور وہ غالب سے فہم مند رکھتے تھے۔ یہ گروہ غالب کی مخالفت میں اپنی آزاد و مختصر بھی کرتا رہتا تھا۔ ایک جمہور کا یہ شعور غالب کے اکثر ذکاوتوں نے مثال کے طور پر دیکھا ہے۔

کلام تیر کہے اور زبان میرزا کہے  
مگر ان کا کیا ہے آپ ہمیں یا خدا کہے



دولت کے زمین میں ہی لوگ تھے جب انہوں نے یاشار کے تھے۔  
دستِ بخش کی تمنا نہ ملنے کی بدولت  
گرنے میں ہیں میرے اشاری سنی زمیں

سود سزائے کمال سخی ہے کیا کہنے  
سقم بہائے صلاح ہنر ہے کیا کہنے

غالب سوختہ جاں راجہ بگٹا آری  
ہر دیا دوسے کہ نہ دانند نظیری از عقیل

آخری دو شعروہ آئی شکایت کے حدود سے نکلی کر کلیات میں کرنا بیچ تہذیب کے قدیم ترین ادوار سے لے کر  
ہمارے اپنے دور تک درست ثابت ہو رہے ہیں۔ آج بھی ایسے لوگ اکثریت میں ہیں جو غالب اور نظیری کی عقلیت اور انصاف  
کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کرتے اور جب غالب پر ہلکا شخصیتوں کے لیے اپنے دلوں میں حسد کے سوا کوئی دوسرا جذبہ  
نہیں پالتے۔

غالب اپنے حامدوں میں کسی کو اپنا ہم قرن اور ہم فرائض نہیں سمجھتے تھے اور بظاہر ان کے ایراد و عیوب کی طرف  
سے بے پروا نظر آتے تھے لیکن ان کے قلم و کلام پر اعتراضات کی دھجھکاڑ نے ان کو اتنا تنگ کیا کہ انہوں نے شہسوارِ ریختہ  
کے ایک دو جزو یعنی مجموعہ آئندہ و گونا گونا گونے رنگ کے قلام کہہ دیا اور اپنی فارسی شاعری کو نقشِ ہائے رنگ رنگ کا  
مزان دے کر اپنے لیے باعثِ فخر قرار دیا غالب اپنی فارسی شاعری پر یقیناً ناز کریں بجا ہے لیکن فارسی ہائے رنگ  
کا ذہان نہیں تھی اور خواص میں بھی فارسی کا ذوق مٹ رہا تھا۔ آج برصغیر پاک و ہند میں غالب کا نام ان کی اردو  
شاعری اور اردو خطوط کی بدولت زندہ اور مشہور ہے۔

غالب نے چار چار آشوبِ زمانہ پایا تھا اور اس پر انہوں نے اپنے اردو خطوط میں بھی کھول کر غم اور  
غصہ کا اظہار کیا ہے۔ یہاں تک قربات بگڑیں آتی ہے۔ واقعے بڑی آزمائش اور مصیبت کا زمانہ تھا جس کو  
جہاں تک غالب کو سمجھا۔ غالب نے اس شعور میں احساسِ محرومی کا اظہار کیا ہے وہ بہت صحیح ہے :-



نہ مراد دولت دنیا نہ مرا جبر جیل

نہ چو نرود توانا نہ شکیبہ چرخ علیل

اس شعری لہجہ حالت کی جو تصویر پیش کی ہے وہ درست ہے۔ البتہ ہم انہیں گنگہ غالب کو تخیل کی شکیبائی میر نہ جو سکی۔ یہ ان کے اپنے ذاتی حلاج کا تصور تھا۔ آخر حیر کر بھی تو جہاں ان کا زمانہ ملا تھا۔ مگر باوجود اس کے کہ زمانہ اورا بنائے نہ ملنے پر کچھ بھی کہی ہیں جو مہل کنی یا سب دشمن کا انداز لے رہے ہیں۔ حیرانہ کر دیا کی سالمیت اور اپنی شخصیت کے ہتھکڑیاں قائم رکھتے ہیں۔ غالب اپنے بلند آہنگ اور علیل القدر چھایم کے باوجود بھی زندگی کی آزمائشوں کا ذکر کرتے ہوئے ضبط و قلم و قار و تلکنت کو برستہ نہیں رکھ پائے۔ یہ ان کی ذاتی کمزوری تھی۔

بہر حال غالب کو زمانہ کی گروہش اور اس کی ناسازگاری کا جو ذکر تھا وہ بشریت کا تقاضا تھا۔ اس پر ہم کو باز پرس کا کوئی حق نہیں بلکہ غالب کی اس شکایت کو ہم مشکل ہی سے تسلیم کر سکتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں ان کی قدر نہیں ہوئی۔ اہل کمال کی اہل کمال ہی قدر کر سکتے ہیں۔ خواص کی قابلیت کو خواص ہی پرکھ سکتے ہیں تاہم ان کے کسی قدر میں بھی اکثریت جو ہر قابل کے حق میں ناشتہ مہیا رہی ہے۔ پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غالب کس قسم کے خارج المکرز جو ہر قابل تھے تو خواص کو خواص تھے اگر خواص میں ان کی قدر کا اندازہ کرنے سے قاصر رہ جاتے تو ہم ان کو معاف کر دیتے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ خردان کے زمانے میں غالب کی جن قدر و عزت رہی وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ملتی ہے۔ خواص کے ہر حصہ میں لوگ ان کی بہت اور عزت کرتے تھے اور ان کے ساتھ خلوص و نیاز کا تقاضا رکھتے تھے۔ اور اب علم و فضیلت میں غرض مند و الدین نرود مولانا مام بخش سبانی مولانا فضل حق خیر آبادی جیسے بزرگ و جتیاں غالب کے عزیز مولیٰ و بہن اور ان کا بہنوئی قابلیت کے سزوت تھیں اور ان کے ساتھ شفقت اور محبت پر ہی تھیں۔ شیخ فیض الدین غوث کالے خاں جیسے مانے ہوئے بزرگ و دہایت کے ساتھ غالب کے تعلقات بے تکلف واد تھے۔ نواب ضیاء الدین خان رضائی نیز نواب الہی بخش خان معروف، نواب علاء الدین خاں ملتان جیسے امیر اور رئیس غالب کے مستند تھے۔ شاعری کا کھڑا ذوق رکھنے والے غالب کے سر پر تھے۔ جوان کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے وہ بھی غالب کی صحبت کو اپنے لیے فخر سمجھتے تھے اور شعوری طور پر ان سے اثر قبول کر رہے تھے۔ نواب مصطفیٰ خان شینہ و حمرق نہیں جہاں گیر آباد جو سوس کے شاگرد تھے اور غلام علی دشت ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ غالب کے ہم چشموں میں حکیم حسن خاں سوس کا نام سب سے زیادہ اچھا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے مزاج و دل



تھے اور پتے دل سے ایک دوسرے کی قدر کرتے تھے۔

اب ان لوگوں کی طرف آتے جو غائب سے غائب کہتے تھے۔ غائب کو شاگرد بنانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور وہ شاگردوں کی کثرت کو ٹھکر بات نہیں سمجھتے تھے لیکن جو کوئی ان کی شاگردی کا آمنا منہ جوتا تھا یا اپنے کلام پر اصلاح پاتا تھا اس کو وہ بھی پارس نہیں کرتے تھے بلکہ ندرت فروغ دل کے ساتھ اس کے شعاع پر اصلاح کرتے تھے اور پیش اس کے ساتھ خلوص اور شفقت کا پیمانہ ڈالتے تھے۔ جن رئیسوں اور شیروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان میں بیشتر غائب کے شاگرد تھے اور بعض ایسے تھے جو غائب کو اپنا کلام دکھاتے یا سناتے تھے اور ان کے انکار و آراء سے بہت دُور و مستند و مستقل اثر قبول کر کے اپنی شاعری میں جذب کر لیتے تھے۔

غائب کی بے نیاز طبیعت کے باوجود ان کے شاگردوں کی تعداد کثیر تھی اور سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی دہلی اور نواح دہلی میں ان کے جو شاگرد ان سے زیادہ قریب تھے ان میں نواب ضیاء الدین خان بنو درخشاں اور نواب علاء الدین خان ملتان کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ملتان کے علاوہ اعطاف حسین صاحب مرزا زمین العابدین خان صاحب درخشاں کی مثال کے چٹے تھے اور جن کی غائب نے اپنا کلام دکھایا تھا امیر محمدی مجروح اور شیخ بزرگ پال آفندہ غائب کے بڑے محبوب شاگرد تھے۔ اسی زمانہ میں ایک اور شاعر سراہہ جو مل گڑھ کا رہنے والا تھا غازی کا مستحق تھا جو اپنی لالہ نام تھا۔ غزل نویس کرتا تھا۔ کمالت ذریعہ معاش تھی جس وقت مرانی نے غزل کو غائب کا شاگرد بنایا ہے۔ اور اور وہ نے مسل علی کسی مجلس ان کی غزلوں کا مختصر انتخاب میں خالق کو پایا ہے۔ بنارس ریورنوٹی کے ٹی ٹی میٹس پر شاد نے غائب کے غزل کا جو نسخہ شائع کیا ہے اس کے مقدمہ میں جہان طور پر لکھا ہے کہ غزل غائب کے شاگرد نہیں تھے حقیقت یہ ہے کہ غزل شیخ بزرگ پال آفندہ کے شاگرد تھے جو غزل غائب کے مورخ ترین تلامذہ میں تھے۔ اس طرح غزل کا نسب شاعری غائب ہی سے ملتا ہے۔ جب ہم شیخزادہ ملان مجروح کے دہلی سخن کو سامنے رکھتے ہیں غزل کے کلام پر نظر آتا ہے۔ ہم یاد دہی کو غزل و ادب کی گھنٹی کے دبستان کے شاعر نہیں معلوم ہوتے۔ بلکہ غزل جو تاج گزبان و دیوان کے دھڑکندہ کے ساتھ غائب کے کلام کے اصلاح عناصر سے وہ اپنی شاعری کے مورخ کی تربیت کرتے رہے ہیں۔

یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ غائب کے کلام اور مستندین کی تعداد اتنی کم تھی کیوں وہ ہی ہوا انہوں نے انہوں ہی کے شعاع پر اصلاح کیوں نہ کی ہو وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ان کی پیروی میں غزل کو غزلوں کے مورخ سے پیش ہوتا صاحب دیوان کو غزل کا کوئی اختیار کرے اور جب وہ کسی کے کلام پر اصلاح دیتے تھے تو صاحب کلام کے مبلغ غزل و ادب و شعاع کو پیشہ و نظر رکھتے تھے۔ غائب کو اس تھا کہ انہوں نے اپنے لیے جو یہ ہیں اقبال انہوں نے



اور رنگ حق متبہ کیا اس کو خود تر بہاؤ لے گئے لیکن اگر وہ مرنے سے مستفید ہونے کے بہانے اس کی اندھی تقلید کی تو اردو شاعری کے بدلہ ہر جانے کا غلغلہ ہے۔ اس میں قابلِ توجہ ہے کہ غزوہ خائبہ کے زمانہ میں بھی شعرا کی تخلیق نہیں کی۔ ان سے فیضِ بابت چٹنے بھی ہوئے ہوں ان کی طرزِ لانے کی کرشمہ تزیینیں صدی کی پہلی چترتھی کے اندر پہلی اور بعض نا عاقبت انفرش شاعروں کے سر میں خائبہ جتنے کا سودا سلیار یا لیکن یہ شعور خود کو کئی نور واصل نہ کر سکے۔ البتہ خائبہ کی شاعری کو بدنام کرتے۔ اکثر غرضیں اختیار و جزا میں نظر سے گذر گئی ہیں جن کی نمایاں خصوصیات ہماری انفرادی ترکیب اور غرضوری قضیہات و استعارات کی بحر و اور معنی کی قلت یا معنی کا احتمال ہے تقریباً یک سو سال پہلے کچھ اشعار پڑھنے یا سننے میں آتے تھے۔ وہ بھی اشعار نونہ کے طور پر حاضر ہیں۔

سر شوریدہ پائے دست پیرا شام بھراں تھا  
بکس مگر تھا بیا بیاں میں بکس مگر میں بیا بیاں تھا

اور ان لہجوں کا یہ انداز ہی چشمِ قاتل ہے  
زخمِ دھان کتبہ تعلیمِ محسّر چاہِ بابل ہے

یہ میر تقی کے ایک مشہور شعر کے اشعار میں جو اپنے زمانہ میں استاد مانے جاتے تھے اور شاگردوں کی خاصی تعداد رکھتے تھے۔

ایک اور شعر یہ تھا کیا۔

پھر انہی جتنے آج گاہ افتاب  
دار کو پھر حسرتِ نظارہ منسوب ہے

یہ جہانوں کے ایک صاحب کا شعر ہے جن کی خوشیاں اخباروں میں چھپا کرتی تھیں۔

خائبہ کی طرف جو لوگ آئے ہیں اور ان سے اصطلاحی یا ان سے حاضر قبول کرتے رہے وہ بڑی سلیم اور صالح طبیعت اور بڑے مستقیم اور حکم کو دار کے لوگ تھے۔ ان میں میں نے شینہ سال اور دہائی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے اس لیے کہ خائبہ کی نگاروں کے لبِ اظہار کا جو اثر ہماری نظم و نثر میں آئے ان قریح کے طبع پر اب تک ہماری ہے وہ ایک مسئلہ ہے جن کی ابتدا ان کی ازلی تینوں شخصیتیں ہیں۔

شینہ سہریں کے شاگرد تھے لیکن خائبہ سے ان کی اصل تھا اور پہلے ان میں وہ خائبہ کے رفیق اور بہادر



تھے۔ ہر کسی کے شاگرد رہتے ہوئے میں وہ ناسیب سے مشغول رہتے تھے اور میری کے بعد تو وہ اپنا کلام پاتا مٹا کتاب کو دکھانے لگے تھے شیفتر کی غزل سرائی میں زمزمین کی چیتاں نگاری سے کہہ کر ناسیب کا انگری شریف۔ جن کے بیان میں زمزمین کی تشبیہ ہے ذہنی کا خفلی تضاد یا استدلال اور ناسیب کے اسلوب کی غزلیت کی مذکورہ جہش ہرئی قدرت۔ مگر ان کے اردو اور فارسی کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں سائنہ کا ہر چہ ان کے اپنے انفرادی رنگری و فنی شعور کے ساتھ ان کا کام کتاب ہے۔ ان کے اقتدار میں ایک نچر تان سنجیدگی ہوتی ہے اور ان کی زبان اور طرزِ اظہار میں ایک شائستگی اور اعلیٰ حالت کا احساس ہوتا ہے جو وہ زیادہ تھا سب اردو غزل کے مزاج میں فساد پیدا ہو چکا تھا۔ شاہ ولیاوردی و دی و دی میں تاج اور انیس سے مقابلہ اور ساجدی کے میں بخش اور ان دونوں کے علاوہ شاعری کی زبان اور صنائعِ بدائع کی پانزی رنگری بندے ہوئے تھے۔ اور ہر میر و نسیان اور میر بھڑکی کے دوسرے شاگردوں اور دیر آغ و میری اسودق کے پیروں کا مغرور شباب تھا اور ان کی آوازیں لوگوں کو حیرت کوئے لگی تھیں۔ ان کی سستی اور ادنیٰ قسم کی گفت پرستی اور غرضی شش کو آندہ شاعری میں قبلِ عام مائل ہونا شروع ہو گیا تھا غزل میں مبتدال کے انداز و انداز پر چلے تھے جیسے میں شیفتر حال اور ناسیب اور میری کے دوسرے شاگرد غزل کی فطری شرافت اور پاکیزگی اور دس میں ساس و دلکشی متانت کو قائم رکھ کر ان کے فطری لعل کے لیے مثال چھوڑ گئے۔ یہ اصولی کتاب نہیں ہے۔ شیفتر ایک اور اقتدار ہے میں تاریخی طور پر کہتے ہیں۔ اردو شاعروں کے جتنے اہم تذکرے ہیں گئے جا چکے تھے میں نے خوش فہمی زبان میں یہ تذکرہ نگاری کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اس دور میں شیفتر کا تذکرہ نگار بنے خواہ سائنہ آج ہے جو تنقیدی رنگ کا احساس دلاتا ہے بحیثیت اور ترقیب کے لحاظ سے یہ میں تذکرہ ہے لیکن میں اس میں کچھ یادگار نکتے اور فقرے مل جاتے ہیں جو نے نظرِ شاعر کے کلام کی انفسوی تصریحات کی طرف اشارہ کرتے ہیں شیفتر کی تاریخِ حیران اور معقول ہوتی ہیں اور ان کا سب دور و دور قیام ہوتا ہے۔ یہ پرنال سنجیدگی اور ہلکا و شائستگی شیفتر کا اپنا مزاج ہے لیکن اس کی تشریب میں ہر کسی کے شاگردی اور ناسیب کی صحبت کو میں بہت جڑا دل ہے۔ جیسا کہ نسل نے شیفتر کی ناقولانہ بصیرت سے میں بہت کچھ پایا ہے۔

حالی ناسیب کے ہم در شاگرد تھے اور شیفتر کے رفیق و مجلسِ صفوں سے ان کو قرب و اقرب حاصل تھا۔ حالی کتن جیشور ہے اردو ادب کی تاریخ میں یہ شریف۔ حالی کی یاد آتے ہی ہمارا ذہن بے ساختہ اردو شاعری کی اس صنف کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اصطلاح میں غزل یا غزلِ مبدیہ کہلاتی ہے۔ اور جس کے بانی حالی اور آزاد دونوں ہیں یہ مروج مقبول مروج حالی ہی کے کتب است کی بدولت ہوئی۔ یا میر و نسیان یا اس حالی کی طرف جانا ہے جس نے اردو میں جدید رنگ کی تخلیق اور غزل اور نثر کی سوانح نگاری کی ذمہ داری نبھائی یا کچھ اس کو کچھ یہ سب قبول بنایا کہ آج تک ہم تنقید اور صنائع میں





انہیں کھانا لے بہتے راستہ پر نہیں ملے کرتے ہوتے آگے بڑھتے چلے آئے تھے یہ مقدمہ شعور و شعریہ اُردو میں  
 پہلی بار درستہ لکھنے پر جس میں شعور کی ماہیت اور فعالیت، شعور کی اصول و اوضاع اور اس کے اصناف و مراتب  
 پر بلاوجہ بحث کی گئی ہے اور ان کے عیس کا سنیگی اور شائستگی کے ساتھ ساتھ لیتے ہوئے بلے اُردو میں اور پہلی بار  
 کے شعرات سے ہم کر کا گاہ کیا گیا ہے۔ یہاں سے صحت اور باوجود غائب چلے آئے اُردو میں ہیں جو آؤں میں جو یہ صحت  
 نگاری شعور اور شعریہ ہر اُن کی تفسیر اور ان کے تفسیر کا نام ہے یہ چھ کے اخلاص، اشتاد اور اشتاد پر تجویزاتی اور شعور و شعریہ  
 کا ایک تیار اور مستحکم سیارہ قائم ہو سکی گا یہ ترک ہوا بہت بڑا اور اس میں ہے جو تمام عالم طے کا کام آتا ہے اور جس سے آئندہ  
 تفسیر میں کچھ بے نیاز نہیں ہو سکتیں۔ عام خیال یہ ہے کہ عالم اس سے متعلق ہوں اور اس میں نفس کی حقوق تھے جو شعریہ افراط  
 کی وجہ سے ہماری تفسیر اور ہمارے معاشرے کے ہر شعبہ میں یہاں چلی تھی اور جس کو سرسید اور ان کے رفیقوں نے شعور  
 شعریہ قبول کر کے بہت جلد عمل لگوا کر کچھ کی شکل صورت دی۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔  
 لیکن بات اتنی ہی نہیں ہے۔ ذرا سوچتے ہی نفس کے ادا کی میں بعض صورت ہوا اشتاد چلے تھے نتائج، اُردو اور اس پر  
 میں ہی نفسا غصیب ہوئی۔ ذوق بھی اس دور میں نفس کے پروردہ نہیں تھے۔ ہر اور ادب اس نفس میں مانع ہوتے انہوں انگوں  
 کی ذمہ داری تھی نفسا کے انہوں نہیں تھے۔ ان لوگوں نے وہ ذرا کیوں اختیار کیا اور شعریہ کو تفریح یا سستی قسم  
 کی پیش کش اور لذت پر ہی بنا کر اس میں چاہا کیوں نہ ہو بہت اہم سوال ہے اور اس کا جواب صرف یہ ہے کہ نئے  
 اسباب و ذرائع اور میلانات اور ان کی کھینچ اور ان سے صحیح اثر قبول کرنے کے لئے جسے حق شناس اور صالح  
 زمین اور جوش و خروش کی ضرورت ہے غلاب نے یہاں زمین اور یہی اشتاد ہوا تھی اور ان کے جتنے شاگرد و متفاد  
 جتنے ان کی عظمت و لوگوں کے سامنے دئے تھے سب حق شناس اور مقبول پندہ تھے۔

ذکر حال کا تھا باہم مالی کی تھوڑی اور لذتی کارناموں میں کچھ ایسا ہو جتے ہیں کہ ان کی ایک اور اہم حیثیت  
 کی طرف دھیان ہی نہیں ہوتا ان کی یہ حیثیت سرسید کے عیسو اثر میں آنے سے بہت پہلے قائم و مستحکم ہو چکی تھی اور  
 یہ ان کی اولین حیثیت ہے۔ وہ اپنے عصر کے صرف اچھے غرض لگتے بلکہ غرض کی ہر مشا از خصوصیات انہوں نے مقدمہ  
 شعور و شعریہ میں لکھی ہیں ان سب کو فی غرضوں میں برتا گیا ہے اور یہی بلے اُردو میں کہتے ہیں کہ انہیں بلے ہے ان  
 سے خود غرض کے ساتھ جھٹکا گیا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عالم نے غرض کو ڈوبنے سے بچ کر اس کی اثر اور خوشی کی حفاظت  
 کی صورت برائی کے باوجود ہی کیا کیا ہے کہ انہوں نے غرض کا اس کا کیا ہے۔ بہت صحیح ہے لیکن اس میں اس میں شاید  
 دشواری ہوئی اگر وہی اور فیض اس کو روکا اور تو ناچار چھوڑ گئے ہوتے حالانکہ ان تمام اصول و خصوصیات سے



مصر بہتے ہیں جو نغزوں کی نفرت میں دھال میں یہ عرصہ اعتدال کے ساتھ ایسا شائے بھی بہتے ہیں جتناں انچیز بہتے ہیں  
 نگر جہاں کو سحر نہیں بہنے دیتے جن کے شہر دراز سواں بہتے ہیں ہاں کا سبب وہ ہے کہ اقل آدمی کے ہر عین صلاحت  
 روی قہم پر بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی قہم بدھو یہاں کو فتاب جیسا صاحب ہوش و نظر استاد صلی کے ساتھ ملکر اپنے گھر  
 ارواقت قہم س کے ان کی تخلیق ہیست کو بلا بخش ہم اس رتق پر مالک کے صرف چند اشعار کی طرف توجہ دلا بہ ضروری  
 سمجھتے ہیں۔

پڑے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے  
 شکوے وہ سب سنا سکتے اور سہاں ہے  
 دریا کرنی سراج کی غصہ نہیں سے کام  
 کشتی کسی کی پار ہر پار درمیاں ہے

ہے جیوتو کو خوش ہے بے خوب ترکاں  
 اب شہر تہ ہے دیکھتے ہا کر نظر کہاں  
 اک عمر چاہیے کہ گوارا ہوشش حش  
 دکن ہے آج لبت زخم جیگر کہاں  
 یہ قرار قہم سب امید طاقات کے ساتھ ایسا لگی ہی درازی شب بھریں میں نہیں

سنت شکل ہے شبیرہ تسلیم  
 ہم بھی آخر کوی جیسو تے لگے  
 کس سے بیان دقا بانہو رہی ہے بیل  
 کل نہ پہاں کے لگی کل ترکا صحت

گٹ گٹیں کچھ غصہ یاں ایام کی  
 جڑو گئی ہے یا مشکیاں بہت



اگرچہ سید معلوم نہ ہو کہ حاکم کو نائب ہے مگر ماسبق یہاں اس شخص کے تمام مشورے مل کر چلے گی بہت سادہ  
غریبات مائل کو سامنے نہ کر رہے ہیں تاکہ اس کے شکار ہو سکتے ہیں کوئی غلط فہمی نہ پھیلے اور نہ ہی کسی کو اس کے خلاف  
کے شکار تھے یا نائب کا اثر ان کے کلام میں نہ پڑا ہے۔ یہ اور پرچہ ہے تاکہ اس کا پتہ چلے۔

عمر بنی شخصیت یعنی سرست کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ ان کی یاد اب تک  
دلوں میں جاگ رہی ہے۔ ہر طرح کے مسلمانوں کو ایسی اور جہاد کی ہلک خفا سے نکال کر اس میں داخل اور نکلنے والے  
جس راستہ پر انہوں نے لگا دیا اس پر ہم آج تک گامزن ہیں اور ترقی کے ساتھ مزید اس کے کرتے پرتے آگے جا رہے  
ہیں سرستہ خود اپنے زمانہ میں اعلیٰ حرج کے مصلحتوں کا نشانہ بنے یہ سب ضرور ماضی کر رہے ہیں۔ مگر اس کے بارے  
میں جو کثرت میں تھا ان کو رسالہ خود کر کے یہی کہی ماسبق یہ تھا جس کو اٹھا رکھا ہو۔ ان کو کیا کیا نہیں کیا گیا۔  
کافروں پر یہ دیکھنا ہی ہے کہ وہ القاب میں سے ان کو لڑا گیا تھا اور آج بھی سرستہ کی عظمت کا بخندہ دلوں کے  
ساتھ ایسوں کی کہ نہیں جو سرستہ کے تاریخی کام سے تباہی برت سکیں ان کو انگریزوں کا پرستار اور مذہب پر غارت کا ہوا رہ گئے  
ہیں۔ ہذا اقتدار سرستہ سے بحث کرتے ہیں۔ یہ لیکن ان کے اندر کچھ خصوصیات دلوں کے دلوں کو پیش نظر رکھنا ضروری  
ہے سرستہ اگرچہ کوئی بڑے عالم داخل نہیں تھے لیکن وہ بڑے بڑے مفسرین تھے اور جو بڑے مفسرین ہوتا ہے وہ قوتوں  
سے قوتوں کے علم کرید سے عید عالم کے مقابل میں زیادہ متحمل اور ذمہ دار ہے کام کر سکتا ہے اس لیے کہ اس کے اندر علم  
سے زیادہ شعور ہوتا ہے۔ سرستہ کی علمی استعداد کو مبنی ہیں یہی پہلوں کا خفا غلبہ علم حکمت میں ایک مقام رکھتا تھا اور اس  
زمانہ میں علم حکمت کے معنی مسلمان خاندانوں میں خفا میں علم و حکمت کے تھے کیونکہ اس زمانہ میں سب سے زیادہ بحران  
مسلمانوں کی قسمت میں تھا اور وہ آخر سر پر اس پالی تہذیب پر تکیہ بھی ہندو مسلم تہذیب کے نام سے یا تو کیا ہے  
اور ہر وقت ان کے دلوں میں بیکار اور بیرونی طاقتوں کے جابرانہ اور جابرانہ باتوں کے باوجود جو غیر ہندو پاک میں کسی طرح نیست  
نابود نہیں ہو سکتی بہت بڑے خطرے میں تھے۔ اس تہذیب کی آخری ورثہ اور عظمت عقیدہ حق پر مبنی تھا۔ اہل ہندوستان  
جنگ عظیم سے پہلے ہی بالکل بے دست و پا ہو کر گئی تھی۔ نائب بنی خفا میں ملنے کی آخری اور آخری ہجرت و  
ہجرت کے ساتھ زمانہ کی اس گردش کا نشانہ بن چکے تھے۔ سرستہ ایک باخبر اور نوجوان کی حیثیت سے اس گردش سے  
گزر رہے تھے۔ نائب اور سرستہ دونوں کو اس خفا میں سیلوٹ کے نفاذ کا علم تھا اور دونوں ہی چاہتے تھے کہ کس حالت  
پر ہجرت نہ ہو۔ بلکہ مانتے لیکن دونوں کے میں احساس تھا کہ اب محض چاہتے نہ رہتے اور مسائل سے کام نہیں لے  
سکتے۔ نائب اور سرستہ دونوں خفا والے اللہ سے لے کر تہذیب اور شاہ و ساجیل شیعہ تک ان تمام مصلحتیں دیکھ رہے

[illegible]

دیده بین آمد با نذری  
کشتی پر شیبه تشریف لری

دوئی که در تعجب آئین زانے است  
نگه مادریت و آلائے است

اس کے بعد وہیں بیجاوات اور سنی سپاہ ترقی اور صحرائی اور آئین اصلاحات کی طرف توجہ دہانے میں  
جدا نظر نے دراصل تو اپنے استعماری اور استعمالی مقاصد و مصالح کے لیے اور اقتدار و حکومت کی سبھرا و تشکر پانے کے  
لے کیا کیے گئے۔ آج کل جب ہم نے کام لے رہے ہیں اس کا محض دو رنگ نام کی خیال میں ہے۔ ایمانی کے ترانہ کو صرف تھما دینا۔



انگلستان میں کے شیروانا خانہ ہمارے سو پر کس کے لیے اپنے مفاد کے بدلے کیا کچھ کر گئے اس مسئلے میں شوقی نگار کے کچھ  
اخبار ملاحظہ فرمائیے۔

دادو دافش راہم پرستہ اند  
ہند را صد گزہ آتینا بستہ اند  
آتینے کو سنگ بیسٹون آورند  
ہی ہنر نہاد شخص چوں آورند

سچا فاضل خواندہ اندایاں پرکاپ  
دور کشتن را ہی ماہ صفا پ  
فلو را بے زغر از ساز آورند  
حرفہ ٹھکانا ٹر بے ملاز آورند

کاروبار مردم ہیشیا رہی  
دور ہر آتی صدق آتین کار ہی  
ہیشیا رہی نا تینا کہ در زور و کار  
گشتہ آتین دگر تقریم پار

میں سب کچھ آزموستہ کچھ نکار ہوشیار کے لوڑ مردہ پروردگار سے حکم رہنے کے لیے کہا گیا بظاہر  
سوستہ کو ایک ہر نامہ لڑ ہوا کہتے تھے۔ وہاں کا بہت سا کام ہی اظہار کئے تھے اس میں لازماً فریبگاہی سے ان کو  
بڑی سیدی تھیں۔ سریتاں کو بہت عرصہ تھے۔ وہ دشمنی کو دل سے نکل ہوا دماغ پر ختم کرتے ہیں۔

دو جہاں سید پرستی دین تست  
ازشت بلور دماغ آتین تست



ہی سدا پافرو لرنگ ما  
 سید احمد خان عارف جنگدا  
 ہرچہ خراب از خدا سرچر و یاد  
 پیش کارشس خایس سوز یاد

سرستہ طبعی نڈا شاعر تھے و نشانچہ دان، اگرچہ وہ آپنی شخصیت رکھتے تھے اور، آئل ٹریس، انہوں نے خطوط کے جو  
 اس وقت ملتے تھے میں میں، وہ ایک منظر تھے اور لوگ ایک نظام اگر تھا میں کی بنیاد ان کا درست اور عملیت پر تھی۔ اس کا  
 نصب ایسے ایک سید صاحب کو پکا کر اس کو اپنی زندگی اور کوئی آئی سے سمجھ کر تھا ایک عظیم کردار تھے اور اس  
 وقت ہمارے میں، گھڑا تھا اسلوب جانے کے خطوط میں تھا۔ وہ اپنے نصب میں بہت جلدی مددگار کہ سہا پہ  
 اس صاحب کو ایک نڈی جو یہ اور وہ لب یعنی اور وہ نظم و نثر میں تھا اس لیے اس کو سبب کے ساتھ اور زبان اور اس کے  
 ادب کی طرف تھی پہنچا اسے مستحق کے تمام تخلیق کاروں کی تھوڑے سے تھوڑے کے ساتھ اس کو رہے تھے کہ  
 اور زبان اور اس کا اب کے جہان میں اس کا سبب کہ رہے تھے اور اس کو تھی اس لیے اس کو تھوڑے سے تھوڑے کے لیے اس کو تھوڑے سے  
 کہ ضرورت ہے تاکہ وہ اس کے تھے تھوڑے سے پہنچا بلکہ بہت سے صاحب کو زندہ اور صحت مند رکھنے میں مددگار ثابت  
 ہو سکیں۔

سرستہ اور وہ اس ادب کی تاریخ میں تھیں اقتدارات، سلام میں سب سے پہلے کہ اس نامانی تھی وہ شخصیت  
 کو یاد رکھنا چاہیے کہ سید صاحب نے اس ادب کے بنیاد میں ہیں کی بنیاد اس کا ایک سو ساتھی مسلم اور کیش کا انورس  
 اور اسے اس کا ایک مل گئے اس کے ساتھ میں سرستہ کا تھا جس شخصیت کے بہت سے مل گئے اس کے لیے اور اس کا اس کا  
 کہ اس کو سبب میں اس کے تھوڑے سے اس کا سبب کہ اس کے تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے  
 ادب کی تاریخ کا ایک شخص باب میں ہے۔

تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے اس کا سبب کہ اس کے تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے  
 تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے اس کا سبب کہ اس کے تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے  
 تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے اس کا سبب کہ اس کے تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے  
 تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے اس کا سبب کہ اس کے تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے اس کے تھوڑے سے



سرستید کے لیے بڑی مشکل تھی کہ ان کے ساتھ دوزخ کا کوئی ایسا اسلوب نہیں تھا جس کو وہ اختیار کرتے اور اس قابل ہوتا کہ ان کے تمام فکری نظام اور عمل و خصلتوں کو جھینگ اور سادگی کے ساتھ کثیر سے کثیر تعبیر اور نمائندہ بنایا اور میں کہ سب اس حد وصل پاتے جس حد میں شے کو طرز و رسم سے باخ و بہار اور فساد و عجب و کجی کا کوئی اسلوب سرستید کے مقاصد کے لیے موزوں نہیں تھا۔ ایک غائب کے خطوط کی خبر اس تھی جو سنجیدہ تھی اور شگفتہ بھی اور ہر قسم کے مسائل اور غائبیم کے اظہار پر قادر تھی سرستید نے اس کو اختیار کیا اور اس میں انگریز کا انشا پر کے اسالیب کی کچھ خصوصیات کو داخل کر کے اس کو بالکل اپنا اسلوب بنایا جو ان کے چہنم کو صاف اور شگفتہ زبان میں جو ہم ایک پہچانتا تھا کہ سرستید کی خبر اس ادبی کشش سے یک حکم جاری ہے جو محمود ہندی م دہلوی نے صلی کی بنا و خصوصیت ہے۔

حالی نے شاید سرستید کی خبر میں اس کی کو محسوس کر لیا۔ وہ غائب کے عجیب و غریب خاکوں میں نئے اسلوب سے بہت قریب وہ کہ ان کی شاعری اور ان کی ذوق و فطرتوں کے مزاج کو جیسے برستے تھے اور فطرتوں کی عظمت کے راز سے بہت قریب آگاہ تھے وہ اپنا اسلوب میں وہ شادمانی و بے کاری اور ذہنیادگی کے جو غائب کے اردو خطوط کی جان ہے لیکن ان کی سادہ اور سبک کھف خبر میں ایک تنبیہ اور توجہ دی ادبی کیفیت ہوتی ہے حالی کا خبری اسلوب ایک ماحیثیت میں اپنے اندر دیکھتا ہے اور ایسا ہوتا ہے کہ اس میں تنقیدی یا سوانحی انشائیے بھی کچھ لکھے جاسکتے ہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالی کا اسلوب غائب اور سرستید کا اسالیب کے درمیان ایک مضامینت ہے۔ اگر حالی نہ ہوتے تو یہ یاد و دوزخ کے ادب جتنے میں نہ جاتے کہتا ہوں۔

نثری ذیلیات خصوصیت یہ تھی کہ ان کی نثر کو کس طرح اور کس حد تک متاثر کرتی ہیں؟ یہ بات آسانی سے ہماری بکواس میں آتی ہے لیکن کسی زبان کی شاعری یا قصص و بانی یا غنائی (Lyrical) شاعری اس زبان کی نثر کی تہذیب و تہذیب میں کس حد تک اثر کر سکتی ہے اس کا افسانہ مشکل ہے ہوتا ہے اس لیے کہ نثر پر شاعری کا جو اثر ہوتا ہے وہ بہت غلیظ اور لطیف ہوتا ہے یہ خود اپنی جگہ ایک موضوع ہے جو محض بحث ہوتا ہے۔ بہر حال غائب کی نثر اور نظم دونوں نے جدید اور دوزخ کے اسالیب کا ارتقا میں بڑا حصہ لیا ہے ان کے اردو خطوط نے ہماری نثر کو سادگی اور کمالی کے ساتھ ساتھ سنجیدگی اور طراوی دی اور اس کی شاعری نے نثر میں فکری تعقید اور خیالی خواہش، ایک انداز و فراخی اور چاہائی معارف پیدا کی حالی اور شقی سے پریم چند اور مجاہد اور نیاز فتح پوری اور ان کے بہنوئیوں ایک کا اسالیب کو نظر میں رکھتے ہوئے دیکھنا چاہیے اور یہ دیکھنا آسان ہے عام، مخزون، تمدن و ثقافت سے چاہیوں، میر جگ خمال



نگار اور اس حد تک صبر و ادب و دلچسپی غزل کے سلیب میں جو ترغیبات چاہئے ہوتے ہیں ان کا خور سے مطالعہ کیجئے۔  
قریبیوں کی حد تک ادب نگاروں کی سلیب سے غزل کی ساری خوبیوں کو سمجھیں اور ان کی غزلوں کا مطالعہ ان سلیب میں نہیں کرتا۔  
یسویں صدی کی پہلی صدیوں کے ایک خاص فرقہ (نگاروں) کی بدولت غزل ادب میں بہت مقبول ہوئی جس کو جسم و روح  
پر ادب و لطیف کا بہا دیا اور جس کو خواہ مخواہ کچھ لوگوں نے ایک عجیب و غریب ادبی صنف سمجھا مگر حوالہ دہ محض ایک اسلوب یا سلیب  
تھا اس سلیب کے سلیب میں ایک نیا ادبی صنف خود جوڑی گئی اور شعر و غزل (PROSE POEM) کہلاتی ہے۔ کچھ  
نگار راجہ دہریہ، سلیب میں مدح و ملامت، اپنے صمد کوثر کے کہنے کے اثر کارنگ تھا اور بہر حال غزل و نثر کے استحکام کے ساتھ  
ہر صنف کے گرو نگار اور اس کی تفسیر و مباحثات پڑھنا لازم ہونے لگا شعر و غزل کی اتنی صنف بدلتی راستہ سے گزرتی ہے کہ  
کے بعد ان کا نتیجہ غزل اور غزل کی صفائی، قصبہ، مہر کی اثرات کے، لیکن نگار ادب کی گنجینہ غزل اور اس کی  
بیخ اسلوب کی کیفیتیں جو اسے تخلیق شعری میں جذبہ مہر کی ہر تہ ذہنی اثرات کے انہماک کے لیے ہیں اور اسلوب پر روشنا  
رخسار کرتا۔

لیکن کسی دور یا کسی دہائی میں کسی فرد کو اس کی شاعری کا اثر اتنے دور پر کیا چلا جا سکا کہ بعد کے شاعروں کے کلام ہی سے اس کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ حالانکہ غالب کا اثر زیر بحث اسچکا ہے، اس لیے میری یہی ہمدی کے گمان ہے کہ میری سال کا اردو شاعری پر پھر ڈال لی جائے۔ اس میں مسئلہ اسے اردو شاعری کو نگارو اس میں اس کی فن کی دستور اسے بلاغتوں اور زبان و اسلوب کی ترقی اور انجمنی اور اثر فرخندوں کے میں طرح نمایاں کیا اس کی تغیر اس سے پہلے نہیں تھی۔ جدید شاعری کی ان نام نہاد ترقی صورتوں کی بنیاد میں غالب کی نگارو گفتگو کے آثار و علامات بہت واضح نظر آتے ہیں۔

سب سے پہلے جو اردو شعرا اس سلسلے میں یاد آتے ہیں وہ مراد دشت لکھنؤ کا استاد اقبال حسرت برانی اور شاہد مخدوم باری ہیں۔ مراد دشت کا اصل رجحان دشت جملی شخصیت کے آدمی نہیں تھے۔ وہ عالم قہر اور دغا خیز آدمی تھے۔ اردو ادب کی دورانیہ زبانوں کے اداس کے ان کے ادبیات پر وہ بہرہ مند اور سچا مرید کہنے تھے۔ انگریزی زبان پر بھی ان کا اتنی قدرت حاصل تھی کہ اس میں تحقیقی مضامین لکھ سکتے تھے جو مختلف انگریزی اخبارات و رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ اردو زبان میں مراد دشت انہی تحقیقی مضمینوں میں پہلے نے اردو میں مغز اعلیٰ کا درجہ رکھتی تھی۔ یہ تنقیدیں مراد دشت ہی کے ہاتھ لکھی گئیں۔ اردو ادب میں وہ انیس سو پندرہ میں شائع ہوئی۔ مراد دشت کا لکھنا ان کے شعور و ادب کا عکس ہے۔ یہ محکم قول ہے۔ ان کی حیثیت سے تنقیدیں اردو کی بناء پر صرف مراد دشت ہی میں بلکہ دیگر چھ کلاس کے مراد دشتوں میں بھی ان کی کثرت سے مل سکتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی تنقیدیں تاریخی اور دشت لکھنؤ کی مستقل اور قائمہ کلاسوں کے مراد دشتوں کے ہاتھ لکھی گئیں۔ ان میں سے ہر ایک کی تنقیدیں تاریخی اور دشت لکھنؤ کی مستقل اور قائمہ کلاسوں کے مراد دشتوں کے ہاتھ لکھی گئیں۔





اسنادوں کی دہائیوں، ہزاروں میں صرف چھ شریعت تھے، دیگر دہائیوں کی شاعری میں یہاں مغز اور مستحقہ تھے۔  
تھے اس سے پہلے بیسویں صدی کے ادراک کے بغیر ہر اس آمل کا ذکر آپ کا ہے جنہوں نے مرسیہ کے ساتھ قریب  
ان خدایوں کے جہاد و عذاب کو حق شاہد ہی نگاہ کے سلسلے میں جڑا کر لیا ہے۔ اب وہاں میں یہ غرض اور مکران و شیطانی  
کا ایک ہے۔ دوسرے مسائل اپنے خرافات کے باوجود اس اقدار سے غرض کے ہم خیال ہیں، انہوں نے ہم آہنگ تھے۔  
اس لیے اگر ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۲ء تک کے اردو اور انگریزی کتابت کو گنی دیکھیں گے تو ہم کو یہاں تھے اس کے  
موجودہ ان غرضوں کی کتابت مناسب ہوگا۔ حجت کلکری اس کتابت کے قریب تھے، انہوں نے اس لیے ہم دہائیوں  
پری تھے اور حضرت کی نگاہ سے دیکھ جاتے تھے۔ اس زمانہ میں کسی نے ہر کتابت سے تفریق نہیں کیا اور حضرت کا  
شاعر یا استاد کیا ہوا تھا۔ حجت کو بھی اپنے لیے است و تنبیہ کا چارہ اور احکام شمس تھے جو یہاں مغز و فانی  
کے بیچ اور اشعار کی شکار تھے، شمس کا جلدی یا خفاں ہو گیا اور پھر حجت نے کہا دوسرے سے اصلاح نہیں  
لی۔ حجت شاعری کی فدا اور صلاحیت کے پیدا ہونے کے بعد انہوں نے غرض کی سب سے بڑی جگہ سے جہاد میں کیا۔  
کا دہائیوں میں بہترین اشعار قبول کر کے جذبہ کی لینے کی قابلیت دیکھا تھا، چنانچہ ان کے کلام میں یہ صوفیوں اور  
واع ہیں کے کچھ نہ کیا، انہوں نے جاتے ہیں لیکن خود ان کو کتابت کی چیزیں پر نہ تھا اور وہ اس کا اصلاح بھی کرتے تھے۔  
ایک نئی شریعت تھے۔

مضغ مرخمت الحالب از تقطیر بواسطه اذرق الحالب

چراغی را که در دست و صورت و در گیسو

خدا کی مہربانی و رحمت نے انھیں اس تازہ کے کام کو اپنے لیے نمود بنایا جس کی ہر ذریعہ ناپ کر گئے تھے  
یعنی مسکئی، لطفانی، حسی، معنوی، فطری، انسانی و غیرہ۔

یہی کا قصص بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ غائب کے ساتھ ہماری اور باطنی ہر فریغ کا قریب قریب  
موسیٰ کو نہا دیتے تھے غائب کے ایک نہایت عروج اور سر پر آوازہ نشانگر وسیع نظام عمل غیبی کا غلبہ وحشت تھا۔  
سب سے پہلے وہی نے وحشت لکھنے کی کہ پتہ بخود کو کام نہ لیا وحشت (ظہور و احوال پر لائے دیتے ہر شے اس  
بات کا خیال دلا وحشت کے کام میں غائب کی خفا کا اور نزاکت احساس کے ساتھ غائب کے اسلوب کی لذت  
اور دلگلی اختیار اور ہر اسی کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ ان کے زمانہ کے اکابر میں کہن ہے جس نے ان کی شاعری کی ان  
خصوصیات کو تسلیم کیا جو ہر رنگ اور حال اور شکل کے فروغ دلی کے ساتھ وحشت کے کام میں غائب اور موسیٰ



کے انداز نگاروں اور ناقدوں کی تعریف کی ہے۔ وحشت کے اندر ماسی میں جو کچھ خلیاں کے ہم عمر تھے وہ جہ سے ان کے تعلقات خالصانہ تھے۔ سرسبز علاقہ کا اکثر قبائل اور مولانا غفر علی خاں پانچ سائز جیتاں تھیں۔ یہ سب لوگ صدقہ دل سے وحشت کی فاسدی کے قہر شفا سے تھے اور سب نے ہی کھول کر ان کے کلام کی بارگاہی ہے۔

دھشت کا ذکر کچھ فرمایا ہر گیارہویں گز خروست تھی ہم دھشت کو بھول چکے تھے اور ان کے بارے کے بیزکے تھے کہ شہر کا  
میں غالب کی حضورؐ کے محل یا زینریں آتش شہادت کا آغا حال پر سلسلہ جاری ہے اس میں ایک خلوہ صوفیہ ہے۔

انہی کے نظامِ خلافت اور ایمان میں مختلف فاسد باتیں خواتین، عداوت، تصادم، ہر مکان کی گلی و خرچ  
میں حاصل ہونگ، قتال، آفات، صیرت اور انسانی صورتوں کو پیدا ہوئے تھے۔ وہ خود غرضاً ایک منکر تھے اور منکرین  
کہ مہلک ہونے سے ان کا ایک کتابت اور اس کے سر میں نہایت رنج و اوجہ تھے۔ ان کے خلاف اور غریب کے حق میں اس لیے قائم  
و باب کوئی کلمہ نہیں کہ انہوں نے بال کے منکر و حاکم اور ان کے اپنے دل و دنیا کی تخریب کی تھی۔ وہ کائنات  
کی اہمیت، صورت، انسانی کے دروز و مراد اور ان کی زندگی کے مسائل و معادلات کچھ نہیں تھے اور ان پر اپنے سر پر  
ہونے نہایت رکھتے تھے۔ ان کو اس میں تھا کہ ان کو نہایت ناگوار نہایت ہوتا تھا۔

عجیب اتفاق ہے کہ دشت گلشن کی طرح آقبال بھی داغ و صریحی کے شکار ہوئے اور ان کے ساتھ ان کا ہم ام میں داغ کے اثرات صاف نمایاں ہیں۔ داغ کی دھات پر انہوں نے جو نظم کہیں چھاس سے تھا ہر تاجہ کران کے دل میں راستہ کی گنتی عزت اور محبت تھی۔ وہ زندگی کا ایک ٹھکانہ اور فرجہ رکھتے تھے جس کی ترکیب میں دنیا کے عظیم ترین ماضی کے عناصر و حوالہ داخل تھے لیکن جو برصغیر میں کا پرانا نظریہ تھا اس کا اپنے ہونے کے لئے ایک پیغام تھا۔ یہاں مسلمانوں نے مختلف کے اثرات و تاثرات کا نہایت صحیح اور خوش آہنگ استخراج ہونے پر نے بھی اپنی نظریاتی توانائی کا حامل تھا ایسا صاحب فکر و تفسیر اور ظاہر ہے داغ کی منزل پر مقصد نہیں رکھتا تھا پھر غالب کی طرف ان کے ذہن کا رخ کیا اور پھر غالب ہی کے نگری اور ماضی اور اجتماعی اور بہت افروشی سے اپنے تخلیقی شعور کو بڑے بقوت پر نہایتا رہنا پڑتی بات تھی۔ آقبال کو اپنے جو شعریں ان کی مغربی حکموں اور شاعروں کا ہر نظر آتا تھا اور وہ غالب تھے۔ انہوں نے غالب کی خدمت میں اپنا خزانہ عقیدت پیش کر کے ہونے لگش و لیر کے آسودہ فلک گرنے کا غالب کا ہم نوا ہو گیا ہے اور گرتے مغرب کے ان حکیم شاعروں میں سے تھا جس کی آواز کے ارتعاشات آقبال کی شاعری میں جا بجا محسوس ہوتے تھے۔ آقبال کی شاعری میں غالب کی توانائی نظر انداز نہ کی زبان و بیان کا اثر گناہی دہائی دہائی اور کس قدر درمیاں اور متعلق ہے۔ اس کو کہنے کے لئے زیادہ تجربہ یا شعریں کی ضرورت نہیں بلکہ وہ سب ان کے اندر



”شمس و شمس مرے سے حضورؐ اور شمس اسلامؐ اور پھر ”الجرید“ اور ”مکتبہ حکیم“ کی غزلیوں کی غزلیوں پر تباہ  
کلام اتم اتم پر غائب ہی کی یاد دلائے ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں تلاش اور فراہم کیا میں غفلت یا غریب کہ غریب کی  
نفس کی کچھ اس طرح پرست ہے کہ اس کو کسی ترکیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

اقبال ہی کے مسئلہ میں میں کہ ہم صرف اور پکست کا ذکر کر دیتا ہے عمل درکار ہوا بھی اور سیاسی مسائل میں  
دولوں کے نقطہ نظر میں فرق تھا مگر دونوں اسباب مداخلت کے ایک ہیں مسئلہ اور زندگی ایک ہی نفسانی مخلوق تھے وہ اور میں  
یکہ رفیق پیش فرائض و دربار آتش۔ وہ یا شکر نسیم اور میر نہیں کے کانی حد تک متاثر تھے لیکن پکست کے کلام کے پختے سے  
تسلیم ہوتا ہے کہ نگر غائب اور بیان غائب سے وہ کچھ کم استغنیٰ نہیں ہوئے انہوں نے ندرت معقول اور غزلیوں کی بنیاد  
تھا۔ ایک شاعر کی اور اس کی عقیدہ میں جو شعرا وادوار اقدار تھا ہے وہ اس بات کا ثبوت کر رہی کہ ادبی شعور حال سے بدلتا  
ستار تھا۔

یہ غزوت مام ہو گیا کہ صورت نے اور غزل کا احیا کیا لیکن یہ کیا کہ ہم کہہ سکتے ہیں غزل کی ممانعت اور اس  
کی ناک دانی کا حال غزل کو کہتے تھے صورت کے حال کی روایت کہ فرخ و دیار غزل کے تاروں کی کپڑا کر رہی تھی جان  
ڈال اور نہ تو انشیاں پر دیکھیں صورت سے اور غزل میں نہنت کا اور شروع ہوتا ہے ہی ایک سے نادر ہر صورت کہ  
اقبال شاعر (ELECTRIC POET) کہ چکا ہوں میر سے حسن اور حسن سے غالب ہمہ پر شمس شاعر  
کا رنگ ان کی شاعری میں ملنے کے ساتھ سروا برہماتا ہے۔ وہ خود میر اور تسلیم کے شاگرد تھے اس طرح میں کی شاعری  
کا شعور میں ایک پہنچتا ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مومن اعلان کے نامہ تلونہ مثلاً شیفٹ صغر ملن  
نسیم دہری میں ملا بخش خلق وغیرہ کا انداز سخن صورت کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ ان کی غزلیں میرا ایسے حسک بھی کسی  
نہیں ہیں کہ خلقی مسائل پر بندی اور ادا بندی سے ہے۔ ایسے اشعار میں حسن جرات اور میں کا رنگ جھلکا نظر آتا ہے  
لیکن تاثیر کی پر گزاردہ سفید کی انشا کے انتخاب کی ندرت ترکیب انشا کی تازہ کاری کا جہاں تک تسنن ہے اس پر  
کی شہادت بھی کثرت کے ساتھ ملتی ہے کہ صورت کی شاعری میں غائب کی روح بھی کا گہری ہے صورت کے ذہن کی  
غالب سے غیری قریب تھا۔ اس کے مزاج کو غائب کی جری کا ہے بال طبیعت کے ساتھ خلقی نکالٹ تھی جو شعری  
بھی تھی اور غیر شعری بھی۔ اس کی ایک ظاہر علامت تو ہے کہ کوئی طالب علم کے زمانہ میں جب ایم اے اسکالری  
عمل گزار میں انہوں نے اس کو ادبی انجمن قائم کی تو اس کا نام ”اردوئے معلیٰ“ رکھا۔ اردوئے معلیٰ کا یہ نام نہ بدلتا ہے  
اردو کی ادبی انجمن کا نام آج تک وہی ہے پھر صورت نے اپنے شعرا وادوار و جہاں کا بھی نام اردوئے معلیٰ رکھا۔



حسرت اپنی شاعری سے ہر ایک جامع الہیات شخص تھے۔ سماجی اقتصاد فی زندگی اور ہستی کی آزادی اور آزادی سے جہالت کے بارے میں ان کا ایک منظم نقطہ نظر تھا اور وہ ایک واضح اور مستقیم عمل انصاف کے علم پر تھے جس پر سب سے پہلے وہ غور و فکر کر رہے تھے۔ شاعری میں ہی ان کا ذوق بجا تھا اور حق کے لیے سرکھڑے کا دل لڑا دینے کو وہ خدا استلزام کے پرشہ میں ظاہر کر رہا تھا لیکن قصائد و تحریک یا فلسفہ کی زبان میں تجویزات، تعلیمات اور فائیات جیسے مباحث پر اگر ان کے کہیں خیالات رہے ہیں تو ان کی بابت حسرت کی شاعری سے ہم کو فی قیاس نہیں کر سکتے حسرت خاص عشق کے شاعر تھے اور عشق شاعری میں حسرت کا نظریہ آجنگ اور اسلوبی ہنرمو میں اور غالب ہی کی عشق شاعری کی یاد تازہ کرتا رہا ہے۔

شاعر عظیم آبادی کا سلسلہ تلمذ خواجہ میر درد سے ملتا ہے۔ وہ میر درد کے ملحق کے دوسرے معروف شعرا میر ضیا خواجہ میر انیس میر محمدی بیدار سے بھی متاثر ہیں۔ میر حسن اور آتش کی آوازوں کی گونج بھی ان کی غزلوں میں عکس ہوتی ہے۔ ان کی زبان میں ہر سلاست اور روانی ہوتی ہے اور الفاظ کی دروہیت میں جو ترقیہ پڑتا ہے اس میں انیس کا بھی حصہ ہے لیکن یہ حیثیت ان کے اشعار میں ایک بہ گرازاہل ایک تہ رس فکر کا احساس پڑتا ہے جو ذہنی ہدیر کی ایک عام نشانیت ہے اور جس کا رشتہ غالب ہی سے ملتا ہے۔

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اردو میں شاعری کی وہ صفت جو اصطلاحاً نظم کہلاتی ہے نہ صرف وجود میں آچکی تھی بلکہ اچھی طرح پختہ ہو چکی تھی۔ تاہل چکست سرود جہاں آبادی وغیرہ کی کوششوں سے اردو نظم میں وہ اثراتی گہر ہوئی وہ نظریہ جمیع وہ اسلوبی نکھار گیا تھا جو ان سے پہلے نہیں تھا۔ شوق قدوائی جو امیر کھنوری کے شاگرد تھے اور ایک تنیم و دبستان کی آخری یادگار تھے اپنی مشہور شعری اور نثری بالخصوص تمام خیال اور جہاد کے ذریعہ ہم کو نئے ہدایت سے آشت کر چکے تھے۔ اس دور کے متعدد ادبی رسائل کی دفع گردانی کیجئے جن کی سربراہی مخزن گردا تھا اور آپ کو بہت سے شعرا ایسے ہیں گے جنہوں نے جدید اردو نظم کی تربیت اور تہذیب میں نمایاں حصہ لیا ہے مگر جن کی آج ہم بولے۔ شے میں ان میں سب سے زیادہ بلند بلکہ مولا کاظم علی خان تھے جو نہایت نو فکر آتش نوا اور ہندو گو شاعر ہونے کے علاوہ بڑے شاعر زبان اور قصہ نگار مقرر اور مصافی بھی تھے۔ حکومت برطانیہ حسرت مولوی کی طرح ان کو بھی بہت شلوک آوی کہتے تھے اور ان کو یہ لفظ بھی جاتی کہتے تھے۔ یہ تمام کھنے والے جہاں تک نئے افکار احساس اور نئے سیلان فکر و تخلیق کا تعلق ہے مغربی تعلیم اور مغربی تصورات و نظریات کے سنوں تھے لیکن زبان و بلیں کی نئی تراش و زرا اشعار اور نئے افکار و اسالیب کی استخراج میں غالب ہی سے سہارا ملتا تھا۔ غالب کے بعد اردو شاعری کی نئی نسل



کی دہائی اقبال لکھی۔

تھمک روز افزوں مقبولیت کے باوجود اس تک غزل ہی اردو شاعری کی ناکھانگ کر رہی تھی اور شاعروں میں اور محاسن کے درمیان غزل ہی پسند کی جاتی تھی اور غزل ہی کی مانگ تھی۔ غزل کی یہ صورت آؤنی آج تک اپنا کام کر رہی ہے۔ یہ جیسویں صدی تک پہل دو ڈائیون تک کا حال ہے۔ عہدِ روپ کی پہل جنگ عظیم کا طوفانِ فرد ہو چکا تھا۔ محکوم قریں اور نوا باریاں سید لگنے ہوئے تھیں کہ جنی آئینی رعایات و حقوق کا سرکار برطانیہ وعدہ کرتی آئی ہے وہ اب ہم کو مل جاتیں گے۔ ہمدرد صغیر بھی بڑی اسٹیگنوں کے ساتھ انتظار کر رہا تھا اور ہم کو دکھایا دولت، ایکٹ کا ہاتھی تھون اور جلیلا لڑا باغ (اور ترس) کا جھیا تک واقف۔ اسی کے ساتھ ترکی کے ساتھ جھانک قیادت میں مغربی طاقتوں کے جابرانہ اور جابرانہ سلوک نے مسلمانوں کو اور بھی برا فرقہ کر دیا۔ پھر دیکھتے دیکھتے ہماری ذہنی فضا بدل گئی۔ ہمارے سامنے اقتباسات و دُور ہو گئے اور ہم کو یقین ہو گیا کہ ہم کو اپنی سیاسی آزادی اقتصادِ فی علاج اور معاشرتی بہبود کے لیے نیا لائحہ عمل مرتب کرنا ہے۔ ۲۱- ۱۹۲۰ء تک ایک دُور ختم ہو چکا تھا اور ایک دوسرے دور کی ابتدا ہو چکی تھی۔

شعرا و ادیب کی دنیا جنی اقبال کی انھیں مختصر راہ اور ملاحِ اسلام ایک سنگ میل کا حکم رکھتی ہیں دونوں ہمارے اندر یہ احساس پیدا کرتی ہیں کہ زمانہ ایک نیا سرِ اختیار کر چکا ہے اور اب نئے راستے پر گام زن ہے۔

انہیں دونوں کی بات ہے کہ دیوانِ غالب کا ترجمہ جدید یا اکثر عبدالرحمن بجنوری کے ہاتھوں مرتب ہوا جس میں غالب پر ان کا مسرتہ الفاظ اور حمدِ آفریں مضمون مقدمہ کے طور پر شامل تھا۔ یہ مضمون بعد کو تماسِ کلامِ غالب کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں بھی چھپا۔ اور بابِ فوق و فکر میں اس کی دھوم مچ گئی اور غالب ہندِ مجوم لکھے۔ بجنوری شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری کا میزان خود ان کے زمانہ میں تو متاثرانہ منفرد تھا مگر آج بھی وہ اپنی منسکری کائنات اور اپنی اسطوری فضا کی بنا پر سب سے الگ ہیں اور پہچانے جاسکتے ہیں۔ یہ کہنا کافی نہ ہو گا کہ غالب کے تتبعین میں وہ سب سے زیادہ غالب سے قریب تھے۔ وہ غالب میں محو ہو گئے تھے اور غالب کی طرح ان میں سرائیت کر گئی تھی۔ انہوں نے تمام مغربی مکمل شعرا اور دوسرے فنکاروں کا ڈوب کر مطالعہ کیا تھا اور سب کا اور براہِ اندازہ جذب کر لیا تھا۔ اگر غزیر کیا جائے تو سب کے اثرات کا پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ پہلے سے کوئی نہ جانتا ہو کہ وہ مغربی علوم و فنون سے بہرہ ور تھے تو وہ دوسرے غالب معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے عصرِ ساز و ساز کے تخلیقی عمل پر ایک مقرر منظر لکھی تھی جو ترتیب (جاریوں) کے ۱۹۲۱ء کے کس شمسے میں شائع ہوئی۔ اس کا ایک شعر بھی کیا جاتا ہے جس سے ان کے بڑے نگری مزاج کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔



سنگ خدا نے کی نگاہ مگر نے جوں شجاع ماہ

غافل دل میں پائی راہ سب لوہاں خیال تھا

یہی مجبوری کی شرکاء ہیں اندازہ تھا یعنی ان کا شعری اسلوب بھی ہم کو غالب کی شاعری ہی کی دھن میں ملتا ہے۔ ان کی جرائی کی موت اُردو ادب کے لیے بہت بڑا خسارہ تھی۔ صرف چند منظومات اور محاسن کلام غالب حمیت کچھ شعری تخلیقات مجبوری سے یادگار ہیں جو ایک مختصر مگر مکمل شکل میں شائع ہو گئے ہیں۔

۱۹۲۱ء سے چھاپے تھوڑی نظریات اور ناول تصاویر و اقدامات میں ایک نئی منزل شروع ہوتی ہے اور شعر و ادب میں بھی ایک نئی نسل اکبرتی ہے۔ قبل اس کے کہ اس نئی نسل کا جائزہ لیا جائے ایک ایسے بے نفس و بے جا شاعر کو بھی یاد کر لیا جائے جس نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں شعر کا شروع کیا لیکن جس کا چرچا پہلے جنگ عظیم کے بعد زیادہ ہوا اور وہ بھی خواص کے حلقہ تک محدود رہا۔ دل شاہماں پوری ایک سربراہ اور وہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ایک خوش گروہ خوش بیاں شاعر تھے۔ امیر مینائی کے شاگرد تھے اور جلیل بانک پوری کے بعد اپنے استاد کے جانشین متعارف ہوئے۔ اپنے زمانہ کے ہر دوستان کے سربراہ اور وہ شاعروں اور شکرگاردوں سے اپنی سخن دہی اور شعری شناسی کی تحریک داد دیا کرتے ہیں۔ دل شاہماں پوری کے کلام میں امیر مینائی کی شستہ و دستہ زبان کا مزہ ہے مگر وہ اجتہاد اور عایانہ نہیں یا کسی قسم کی جرائی کسی شعر میں نہیں آئے دیتے۔ ان کے یہاں تیسر کی خستگی اور گراؤ کا شعلہ ہے کہیں کہیں مومن کا انداز بھی پایا جاتا ہے لیکن جو خصوصیات ہم کو سب سے زیادہ ان کی طرف کھینچتی ہیں وہ الام زندگی اور الام عشق کا پُر نظر احساس الفاظ کی ترتیب اور فارسی ترکیبوں کا سلیقہ اور اعتدال کے ماحول استعمال ہے جن سے ان کے اشعار میں بلاغت کے ساتھ ایک دم نرمی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ صدی کی خصوصیات غالب ہیں کا ترکہ ہیں۔

انہیں آیام میں مار دو کے دو ہا ہمارا دے سالے چھایوں دلا ہو رہا اور نگارہ مجہولہ شائع ہونے شروع ہوئے جنہوں نے دستان مخزن کی دلچسپی کو بڑھایا۔ پیش رفت رعایت کو فروغ دیا اور اس کو نئے ادبی اور تہذیبی میلانات و خیالات سے معمور کر کے مزید کیا نامی بخش۔

صفی لکھنوی حجاز لکھنوی ثاقب لکھنوی غازی جلیون اور یاس عظیم آبادی کی شاعری نے اس دور میں شہرت پائی۔ صفی کی غزلوں میں جہاں اپنے عصر کی فضا میں پھیلے ہوئے دوسرے اثرات کا احساس ہوتا ہے وہاں تاثر اور اظہار دونوں میں غالب کے خاموش اثر کی بھی علامتیں واضح ہیں۔ صفی لکھنوی کی نظموں میں بھی خصوصیات



مروج دہلی

اس گروہ کے شاعروں میں عجزی کھنوری اس لیے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں کہ انہیں نظم و انضام مہارت یا خبر و علم کے انداز میں غالب کے رنگ میں شعر کو نثر میں کیا اور بہت سی غزلیں غالب ہی کی اندیشوں میں کہہ ڈالیں لیکن ان کی غزلیں میں نہ وہ گہر و در و گہرائی ہے جو غالب کا اصل جوہر ہے اور نہ زبان و بیان میں وہ عمدتہ تغزل ہی ہے جو غالب کی امتیازی شان ہے۔ سوز و گداز کی جگہ عجزی کے کلام میں مرثیت آگئی ہے اور ان کے جہان میں بدلنے کا وقت الفاظ کی بے کیفیت فراوانی کا احساس چرتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غالب کا ٹیکہ غزل تو ایک طرف عجزی کی طبیعت کو سر سے سے تغزل ہی سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ یا تو قصیدہ کے شاعر ہونے لگے تھے یا دیر جیسے مرثیہ نگار۔ چنانچہ فکر کے سے زیادہ سمجھ و لگامیں وہ اپنے اصل مزاج میں نظر آتے ہیں اور اس صیغہ میں ایک منقبت نگار کی حیثیت سے انہوں نے غالب کی جہی کچھ آبرورکھ لی ہے۔ عجزی کھنوری نے ہر صورت ایک نئی صورت تو انجام دی ہی ہے۔ انہوں نے دلہن کی کھنوری غزل کو اس اجتہاد اور سوچیت اور دلکشتی اور رعایت پہنچے پچا ایسا چمکات اور فصاحت امیر مرثیائی اور داغ وغیرہ کے اندھا حوصلہ خستہ کی وجہ سے ساری غزل مرثیائی کو بری طرح آلودہ اور ناپاک بنا چکا تھا۔

مثبت کھنوری کو غالب سے فطری نسبت تھی۔ ان کی غزلیں کبھی تاثر اور فکر کے چمکاؤ نہیں الفاظ اور فطرت تراکیب کی ساخت مگر زیادہ تر دونوں اعتبارات سے دور رہ کر ہائے ذہن کو غالب ہی کی طرف منتقل کرتی ہیں۔ وہ کیف سے زیادہ آگاہی کیف کے شاعر ہیں۔ ان کے اشعار میں ایک پراسشتیاق نال اور ایک مستغرائے درد و غم کی کچھ کچھ جہاد و محنتیں محسوس ہوتی ہیں۔ ان کے بعض اشعار میں دلہن کی کھنوری آواز کی لہریں بھی ملتی ہیں لیکن ایسے اشعار میں ہر اسلوب بیان کچھ غالب ہی کے انداز کا ہوتا ہے۔ بعد کی نسل کے شاعروں نے غیر شعوری طور پر مثبت کھنوری سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

غالبی جہان میں داغ کے شاگرد اور وہ جس داغ کے دوسرے شاعروں سے متاثر تھے۔ ان کے بالکل ابتدائی کلام میں اصل سوز و گداز نہیں ہے بلکہ وہ وقتی دھن ہے جس کو کتبہ عجزی کے خنور سوز و گداز کے عنوان سے پیش کر رہے تھے۔ کہیں کہیں زبان و بیان میں وہ قلعہ یا آبدھن بھی ہے جو خاص کھنوری پیدا داسے۔ لیکن غالبی منکری مزاج رکھتے تھے اور وہ غزلیں قلم وادب سے بھی آشنا تھے۔ یہ وہ پہلے کے متشائم ملک اور شعرا سے وہ خاص طور پر اثر قبول کر چکے تھے۔ ایسا دھن بعض داغ جیسے شاعروں سے آسودہ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے غالب کا بہت جلد غالب



کی سمت، اُنی جو بجا ناقد تھی اور تھاغانی غزل کے شاعر ہوتے ہوئے بھی ایک نظامِ فکر رکھتے تھے جس کو غالب کے فلسفہٴ حیات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ غالب ہر بات کا داغ نہیں لگاتے۔ تھاغانی کے نظریہ کے مطابق ساری تخلیق کی علتِ حشر ہے اور حشر اور نظم ہزاروں اور نظم کا لازمی انجام ہے۔ غالب کی نگرانی میں اس مرگِ انوش اور فدا کیس کو کوئی دخل نہیں لیکن ادنیٰ تو غانی نے غزل میں ایک مسلسل اور نظم پر پیغام دینا غالب ہی سے سیکھا۔ دوسرے اس پیغام کے انور و ابلاغ کے لیے انہوں نے جس زبان اور اندازِ بیان کو اختیار کیا وہ غالب ہی کی دولت ہے۔ کہیں کہیں مومن کی ترنگیتیں بھی آجاتی ہیں۔ لیکن انہوں اور ان کی دو دوستِ خاصہ عسکری ترنگیوں سے غانی اپنی شاعری میں جو راحت اور معنوی نغمہ میاں خیز پیدا کرتے ہیں وہ غالب ہی سے حاصل کی ہوئی صداقت ہے۔ غانی ایک عرصہ تک نوجوانوں بالخصوص طلباء کے دل و دماغ پر چھانے والے تھے۔ ان نوجوانوں میں بعض تو انہیں کی زندگی میں کھوئے ہیے لیکن کچھ تعداد ایسے شاعروں کی بھی ہے جنہوں نے اس دامن سے اپنے لیے ایک الگ دامن نکال لی اور بعد میں خود اپنا پیمانہٴ رستم پیدا کر لیا۔

یاسِ خلیف آبادی اپنی شاعری اور شخصیت دونوں کے اعتبار سے کچھ عجیبِ حتم کے آدمی تھے۔ اُردو غزل کی فضا میں انہوں نے جو آواز جس کی وہ اپنی نوعیت کی تھی آواز تھی۔ ان کی شاعری کی روح و رواں محض جذباتیت (EMOTIONALISM) نہیں ہے بلکہ وہ میلان ہے جس کو جدید اصطلاح میں راداریت (VOLUNTARISM) یا غایتِ کثرت کہنا چاہئے۔ وہ خاص آواز کے شاعر نہیں ہیں۔ وہ ذوقِ معنی اور حوصلہٴ کار کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کے طبع میں جو خاص خیال دہی ہیں وہ تیرہ آتش، غالب اور انیس کے کائنات ہیں۔ ان میں سب سے قوی اور مستقل اثر غالب کا ہے۔ ان کے کلام میں اکامِ حشر اور اکامِ زندگی کی جو کجک محسوس ہوتی ہے وہ خیر کا پتہ ہے۔ مرقا علی اور بانچس کی تعلق کا ہے۔ عزیمت اور اسلوب بیان کی بہروری اور روانی میں کچھ جھجک انیس کی ہے لیکن یاس کی شاعری کو جس خصوصیت نے اس قابل بنایا کہ وہ ہر دور کے نوجوانِ ذہن میں دنیا مروج پیدا کرتی رہے وہ غالب کا تعسفِ کثر بہر حال میں زندگی کے تناقصات و مشکلات پر فتح پانے کے لیے دعوتِ نبرد اپنے نفس اور کائنات کے ساتھ بہادری کی تقصیر ہے۔ پھر ان کے اسلوب میں جو مت میں ترنگیتیں ہوتی ہیں ان پر غالب ہی کی مہر ہوتی ہے۔ غالب ہی کی طرح ان کی ترنگیوں میں زندگی اور جرات میں طرنگی ہوتی ہے۔ غالب ہی کی طرح وہ اپنے استعمال سے پرانے الفاظوں میں جان اور نئی شان پیدا کر دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ غالب اور اقبال کے بعد اگر کسی کی غزل میں زندگی کا دلولہٴ صداقت کی تاب اور جوشِ قدی کی توانائی ملے تو وہ یا تو اس کی غزل ہے۔ وہ اپنی جگہ ایک وقت تھے اور دوسروں کو بھی





متاثر کرنے کی شدید قوت رکھتے تھے لیکن ان سے سختی پونہ بہت دور میں متاثر قبول کرنا شروع کیا اور وہ بھی کچھ غیر شعوری طور پر۔ اس کے ذمہ دار خود ریاس تھے۔ اقبال تو اپنے کلام کی اشاعت کے معاملہ میں وہ بہت بے نیاز تھے۔ اس کو نانا کے اردو ماہنامے کبھی بھی ان سے غریب حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ تجلیوں والا لہور، سب سے زیادہ خوش نصیب تھا۔ کچھ عرصہ تک ماہ ماہ روپاس کا لکھنؤ شائع کرتا رہا۔ اس دور میں ریاس کی سب سے زیادہ قدر لہور والوں نے ہی کی۔ وہ سری بات میں نے ریاس کو نقصان پہنچایا وہ ان کے مزاج کی بڑی بڑا ہٹ اور جھلپٹ ہے جو آخر میں کلیتہً کی مڑ گئی۔ عزیز کھنوی کے گروہ کے ساتھ جھگڑوں کے ان کے غیظ و غضب کا لہیا بھڑکایا کہ وہ غالب پر سختہ ہاتھ لگے اور اپنا دھندلہ را آپ پھینک گئے اور بالآخر ریاس سے بگاڑ چلگیزی ہی گئے۔ اس نے ان کو تنہید اور بازو قہقہہ میں بہت تک بنا دیا۔ آریات پوجا کی آئی کی تقلیدات شعری میں شاہ کا یہ لیکن ان کے کچھ بڑے ہی عزت و فاکت اور گھمبیر سے پی کی عبرت تک شامل ہیں۔

جس کو دانی کا ہم کو کر سہ ہیں جا سے شعور اور چار سے فوقی حمل و دونوں کے لیے نشاط و وجد اور نئی مرگ میں کا ناز تھا۔ اردو دلب میں بھی یہ دانی نئی برکتیں لائی اور خروج اور وسعت و دونوں کے اعتبار سے اس میں نئی بالید گیاں پیدا کیں۔ تجلیوں اور نگار کے ساتھ نہ جانے کتنے علمی و ادبی جرائد و اخبار اسی زمانے میں نکلا شروع ہوئے جن میں سے اکثر شعور مستعمل ثابت ہوئے۔ ایسے جرائد میں حکیم احمد شجاع مرحوم کا ماہوار رسالہ تہزار داستان خصوصیت کے ساتھ یاد رکھنے کے لائق ہے جو صورت اخلاص نے مسلسل ناول ڈرامے اور منظومات شائع کرتا تھا۔ تہزار داستان صوری اور صوری فحاشیوں کا سیلابی خزانہ تھا۔ حکیم احمد شجاع اور ان کا تہزار داستان دونوں اس تہذیب کے ممتاز نمائندے تھے جس کو اگر لاز و تہذیب کہا جائے تو نامناسب نہیں ہوگا اور جس کی پرداخت میں غالب کا کردار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان تینوں رسالوں نے کئی نوجوان شاعروں اور ادیبوں کو کلام صلاحتوں اور ان کی تخلیق کو شششوں سے ہم کو متعارف کیا۔ ان میں جوش ملیح آبادی، لطیف الدین احمد کبیر آبادی، محمود اکبر آبادی، غنیق و بڑی، حفیظ جالندھری، سید عابد علی، عابد اختر شیرانی، میر تقی حسینی شامل ہیں۔ ان سب کے احصاءات و انکار اور اسباب اقبال کے توسط سے یا براہ راست غالب کی اثر آفرینیوں کی علامتیں ہیں ہوئے ہیں۔

۲۱-۱۹۲۰ء کی بات ہے جب شیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کا نام پہل بار ہم نے سنا۔ ان کے رجحانات کا یہ ماحولہ روح ادب چھپ کر ہلے سامنے آیا۔ یہ شعر و شاعری کی شہر کے چند پادروں کچھ غزلوں اور



بہتر فرق اشعار پر مشتمل تھا اور اس زمانہ کے اعتبار اور جوش کے اپنے حیلہ کے مطابق ہنرے اہتمام سے جلد اور  
تصویروں سے نری شائع کیا گیا تھا۔ یہ جوش کی جوانی کا وہ دور تھا جب ان کے لیے ریل کا سفر جنگ کا میدان  
ہوتا تھا اور وہ ہر اس پیش قدمی پر زخم کاری دل پر کھاتے رہتے تھے۔ جوش کی شہرت، بائرن کی شہرت سے  
ذاتی تعلق ہے جس سے وہ خود بھی کئی اعتبارات سے متاثر تھے ہیں۔ بائرن نے اپنے بارے میں کہا ہے کہ ایک  
صبح وہ سو کر اٹھا اور اپنے کو مشہور پایا۔ جوش اپنی عمری نظروں سے یکایک مشہور ہو گئے۔ یہ عینوں نظمیں نگاہ اول  
دل کا تصادم جنگل کی شہزادی اور شہزادہ کی تھی۔ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد مختلف رسالوں  
میں شہانہ پیرہ تھرائی اور کئی دوسری چھوٹی چھوٹی نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ جوش کا اصل مزاج انہیں  
نظروں میں پایا جاتا ہے۔ وہ رومانی طبیعت رکھتے ہیں۔ تفکر اور تحقیق کا تو کوئی شائبہ ان کی شاعری میں نہیں ملتا۔  
لیکن یہ انوارہ مزور ہوتا ہے کہ ان کا شمار ان کے اندر صریح اور شدید عینوں شاعرانہ عقائد کے ساتھ  
ہیں۔ ان کے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری انگریزی کے رومانی شعرا سے ملو حاصل کرتی رہی ہے۔ عالم فطرت کے  
خارجی مظاہر و مناظر کے بیان میں وہ دوسروں سے علیحدہ پرستار ہیں۔ لیکن بائرن اور ہیکے کے رومانی شعر کی احتیاسیت  
ان کے دماغ زیادہ ہے۔ پھر ان کی رومانی شاعری بھی کسی بھی نہ کا ذمہ دہی سے ہوتے ہوئے ہے اور ان کی نظروں میں  
قصیدہ کا اس افغانی شکوہ اور لہجہ کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ شاید فقیر محمد خان گوہر کے وارث اور عزیز کھنری  
کے شاگرد ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔ انیس کی دہائی میں رومانی کی رومانی جوش کے کلام کی ایک خصوصیت ہے۔  
لیکن ان کی شاعری میں جو انحراف میلا ہے وہ اقبال کے واسطے سے غالب کے علاوہ فکر و فن سے مربوط ہے۔  
اقبال سے انحراف کرنے کا تو شاید جوش احتیاز نہ کری مگر غالب سے بے نیازی کا دعویٰ وہ کریں بھی تو کوئی تسلیم  
نہیں کرے گا۔ ہم یہ نہیں بھول سکتے کہ وہ عزیز کھنری کے شاگرد وہ چکے ہیں اور عزیز کھنری ارادہ اور اہتمام  
کے ساتھ غالب کی تقلید کرتے تھے۔ جوش انفرادی ترتیب اور فارسی رنگہوں سے اپنی نظروں میں جو توانائی اور تازگی  
پیدا کر دیتے ہیں اس سے غالب ہی کی طرف دھیان جاتا ہے۔ اس باب میں وہ اپنے استاد سے زیادہ حلیہ  
اور ہنرمندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ انحراف میلا ہے اور جرات انہما جوش کی شاعری کی ناقابل انکار خصوصیات ہیں  
شاعری کی کئی نئی شکل کو ان کی ہی خصوصیات سب سے جڑا حلیہ ہیں۔ اور یہ دونوں غالب اور اقبال ہی سے وجہ  
خصوصیات ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوش انحراف اور عینوں کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں۔ ۱۹۳۵ء کے  
بعد وہ انقلاب کے شاعر کہے جانے لگے۔ لیکن وہ انقلاب اور زندگی کے تاریخی تصور اور نوا میں سے ناواقف ہیں



اور آزادی کو اپنے شخصی حکم کی چیز سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کا غزوہ انقلاب محض نہادیت کا خوش ہو کر رہ جاتا ہے۔  
اس قدر غے میں دو خاص غزل سراؤں کی شہرت ہونے لگی۔ یہ مسٹر گزٹوڈی اور جگر مراد آبادی ہیں۔  
دونوں دو بالکل مختلف افواج کے شاعر ہیں۔

مسٹر گزٹوڈی حسرت مرادانی کی طرح امیر شاہ تسلیم کے شاگرد تھے اور نسیم دہلوی کے واسطے سے ان کا سلسلہ  
موسمی تک پہنچتا ہے۔ زبان اور بیان میں مسٹر کی شاعری کہیں کہیں نسیم اور تسلیم کی یاد و لادتی ہے لیکن غامسی الفاذا  
غلامی تر کہیں ہے جو لطافت اور دلآویزی وہ اپنے کلام میں پیدا کر دیتے ہیں اس سے بلا یا مبالغہ کہ ان کی طبیعت  
بیان غالب کی طرف زیادہ راغب ہے۔ اس میدان میں انہوں نے کچھ اپنے رنگ کی پاکیزگیاں پیدا کر لی ہیں جس سے  
وہ پہچانے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک نگری کائنات کا تعلق ہے مسٹر کو غالب سے کچھ زیادہ وحدانیت نہیں معلوم  
ہوتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسٹر فکر و عقل کے شاعر نہیں ہیں وہ جان و تاثیر کے شاعر ہیں تو زیادہ صحیح ہوگا۔ وہ مسائل  
تصویر کے شاعر ضرور ہیں مگر یہ مسائل غالب کے مسائل سے مختلف اور کشادہ ہیں اور ان کے اپنے تخیل اور اپنی  
بصیرت کی تخلیق ہیں۔ وہ خود مہر و ہر رنگ کے شاعر ہیں اور ان کی ساری شاعری پر ایک مہی (HEBULOUS)  
خفا چھائی رہی ہے۔ مسٹر ان شخصیتوں میں سے ہیں جو خود اپنی جگر جڑی قوتوں کی مالک ہوتی ہیں لیکن دوسروں پر  
اپنا اثر کم چھوڑ جاتی ہیں۔ مسٹر کے تمام کی الفاذا بیت کو سب نے تسلیم کیا کیونکہ کسی نے ان کی تقلید کی نہ کر سکا تھا  
جگر مراد آبادی کی غزل مرانی کا رشتہ واضح سے ملتا ہے۔ جگر کی غزل داغ کی غزل کا ایک بائیدہ زیادہ  
مستحب اور اثر جود کے تعلق سے کے مطابق جدید روپ ہے جگر کی شاعری کا مخرج عشق ہے اور وہ بھی جہانی یا  
حسی عشق۔ مگر انہوں نے اس حسی عشق میں بڑی نرمیتیں اور پاکیزگیاں پیدا کی ہیں۔ وہ عشق کی نازک کیفیوں اور چرخ  
ساعتوں کا تیز احساس رکھتے ہیں۔ وہ شمس کے خراج داں اور دانشناس ہیں۔ ان کے اشعار میں محبوب کے سراپا کے  
ایسے نکتے دیکھے خطبہ اور ایسے پیچ و خم جاری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جو ہم کو نئی یافت معلوم ہوتے ہیں۔  
عاشق کی حالت اور محبوب کے برتاؤ و عمل کی کیفیت اور جگر کی گفت کو بیان کرنے کا ان کو ملکہ حاصل ہے۔ ان کی  
شاعری و ادبی زبان میں او ا بندی اور مداحہ بندی کی شاعری کم جا سکتی ہے لیکن اس باب میں وہ واضح سے  
زیادہ مومن سے قریب ہیں۔ ان کے اس ہمنواں کے اشعار کا رانگہاد ہوتے ہوئے رکاکت اور عریانی ہے پاک ہوتے  
ہیں اور ان میں شرافت اور مصرویت کا احساس ہوتا ہے۔ کہیں کہیں غالب کی سادگی و پرکاری بھی پائی جاتی  
ہے لیکن جگر کی اصفت نہ اسے بے موجد و بحث کے سلسلے میں سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے وہ اخطاک بندش



اور فردوس کی تراش چھا اور ان کا اچانک استعمال ہے۔ جگر کی زبان اور طربیان پر غائب کا ہلکا مگر مستحق پتہ ہے۔ ان کی شاعری کی شہرہ پر ان کی نوجوانوں کو بے اختیار اپنے طوط کیچھتی رہی۔ جگر کی یہ کشش اب تک کام کر رہی ہے۔ کچھ شاعروں کو تو جگر کی ہیروی نے واقف شاعر بنا دیا لیکن ایسوں کا شمار زیادہ ہے جو جگر کی تقلید میں ہلکے کبوتر بن گئے اور اس کے ذہن سے۔

۱۹۳۵ء میں برصغیر ہندو پاک کی سیاسی اقتصادی معاشرتی تاریخ نئی منزل تک جمجمہ میں چھرا کیے گیا راستہ اختیار کرتی ہے۔ اس سال بھارتی سامراج نے برصغیر میں کیرنلٹ پارٹی کو ایک سیاسی طاقت کی حیثیت سے قانونی طور پر تسلیم کیا اور اس کو اعلائے تبلیغ و تنظیم کی اجازت دی۔ فرقہ وارانہ مسلم گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی شکل میں اس سال طرہ اور جدا گانہ انتخاب کے ذریعہ اسمبلی اور مرکز میں دارالکین چنے گئے اور پہلی مرتبہ ٹیکس کی حکومت سنبھالنے کا موقع دیا گیا۔ ایک سال بعد انہیں حق پسند مصنفین کا تحریک اور ادب میں حق پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ سرحد کی تحریک کے بعد برصغیر میں یہ دوسری اعظم ملی تحریک تھی۔ اس نے ہماری فکر اور حقیقی قوانین کو انہی صورتوں سے آتش کیا۔ اردو میں بہت سے نئے سبکدات اسی تحریک کے سلسلے میں داخل ہوئے اور حیثیت اور اسلوب کے بلکہ جدید ترغبات اور ادب میں اسی تحریک کے فروغ میں جن کی تشریح و تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن اگر غائب اور غائب کے بعد اقبال کی آزاد ملی قزاق ولی اور میاکی کے ساتھ نئے تصورات و نظریات کو چاہے وہ کہیں سے آئے ہیں قبول کر کے اپنے فکری حراج میں جذب کر لیتے اور اس سے عہدہ بارہ آزادی اور میاکی کے ساتھ ان کو معرض گفتار میں لے آئے کی جرات چاہے اندر نہ پیدا کرتے ہوتے تو ان باہر سے آئے جو نئے نئے تصورات و نظریات سے انہیں چھوٹے اور قریب کے ساتھ ان کا اظہار کرنے میں ہم کو وقت اور زحمت پہنچی۔

غائب کی غیر فانی شخصیت اور ان کے اثر کی جھلک کا قیاس اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حدود و محصور نہیں رُوح و ہرے کر پیدا ہوئے تھے۔ غائب کے قصور کے ساتھ در و در سودھو گمشتے شیل اور دشمن کی یاد پر فطری ایکنات کے طور پر آہانی ہے۔ ہمیں عالمی منظر شاعروں کی طرح غائب کا تخلیقی نفس انفرادی اور سماجی سے گزر کر آفاق اور آفاقی سے گزر کر کائناتی و سماجی اور گہرائی رکھتا تھا۔ دنیا کی سرحدی و فانی اور مذہب و زبان میں اس مذہب کے کردار اور ناموس کو قائم رکھتے ہوئے غائب کے کلام کو منتقل کر دیا جائے تو وہ اس زبان کے لیے نیا انکشاف ہو گا۔ اب تک اُردو ادب کا مخصوص مادہ و شاعری پر غائب کے اثر کا جائزہ لیتے ہوئے کسی قدر کمزوری یا تخیل سے کام لیا گیا تھا جس کی ضرورت تھی۔ ہم اپنے دور اور اس کے چھپ چھپ سے عجیب و غریب ہوتے جانے



دل سے اسباب و عوامل کی بجائے اس طرح متنازع اور عوامی کمزور و چھوٹی کی عقلوں کے مقدمات تو دیکھنا اور اپنے دور سے ایک نسل پہلے کے بھی کارناموں کی تاریخی ترتیب و تسلسل کے ساتھ کوئی درجہ نہیں دیکھتے لیکن اب ہم ایسے دور میں پہنچ گئے ہیں جس کا استوار چالیس سال سے کم ہے جس کی ابتدا پروفیسر کی کیونسٹ پارٹی کے قیام اور ترقی پسند تحریک کے اٹھانے سے ہوتی ہے اور جو اپنا دور پہچان اس کے اور اس کے اکابر جسی و پیکار اور مشاہیر فکر و فن سے اتنا قریب ہیں کہ ان کے فضائل و مساوی کا تفصیل و تجزیہ کے ساتھ جائزہ دنا اس وقت ممکن ہے اور دنا اس کی جذبات ضرورت ہے۔

گزشتہ چار دہائیوں کی مدت میں غالب ہمارے دل و دماغ میں اس طرح دس بس گئے ہیں اور ہماری فکر و نظریں جدید مغربی حرکات و عوامل کے ساتھ غالب کے افکار و تصانیر اس قدر سراپا کیے ہوئے ہیں کہ ان کی تحلیل کر کے آگ نہیں کیا جاسکتا اور انگل رکھ کر ان کی نشان دہی نہ ممکن ہے۔ آج اردو کا کوئی مخمور یا اشتراک کار ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ غالب کے اثر سے کم تر ہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ لوہ میں ترقی پسند تحریک کی کیونسٹ یا اشتراک کی تحریک کا بڑا ہراند پ ہے۔ جس لوگوں کو اس زمانہ میں ترقی پسند ادیب بھی لگایا یا جنہوں نے خود اپنے کو ترقی پسند کہا ان میں بہت کم ایسے تھے جو کیونسٹ پارٹی سے کوئی واسطہ رکھتے ہوں یا جنہوں نے کیونسٹ کے نظریہ اور دستور کا مطالعہ کیا ہو اور ان کا کہنا ہو۔ جو ادیب یا شاعر کسی نئے خیال یا میلان کا جرات کے ساتھ فنکارانہ اسلوب میں اظہار کرنا تھا وہ ترقی پسند سمجھا جاتا تھا۔ ان نئے میلانات و خیالات میں وہ نقطہ نظر غالب اور عادی ہے جس کو مارکسیت کہتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ترقی پسند تحریک اور کیونسٹ پارٹی کا قیام دونوں ہم تاریخ میں اور موخر الذکر کا گہرا پرتو ترقی پسند ادب پر پڑا ہے۔ یہ حقیقت بات ہے جو کسی دود سے قابل اعتراض نہیں۔

کیونسٹ پارٹی کے مخالف اور انہیں ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں بھی لوگ ڈانٹا دینا تھے اور تحقیر یا تنقید یا دونوں کو ہی صلاحتیں دیکھتے تھے۔ ان میں کہے ان صلاحیتوں کا وقتاً فوقتاً ثبوت بھی دیتے تھے بعض نے یہ گارہ افسانے اور تنقیدی نگاہیں اور اس وقت کے نوجوانوں کو بھی مستحق اور مستعد تھے دیکھتے ہیں لیکن ان کا یہ باتیں پرکائی شاعر نہیں تھا یا اگر کوئی شعر کہنے کی قابلیت دیکھا بھی تھا تو اس نے شعر نہیں کہے۔ سجاد ظہیر نے یہ فیصلہ اعلیٰ ڈاکٹر عظیم، رشید جہاں ڈاکٹر اشرف ڈاکٹر اختر حسین دانتے پوری نے جو علی اور ابی خدات اس دور میں انجام دیں وہ اگرچہ کم حجم ہیں مگر ان کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔



انہیں دلوں میں تین نئے شاعروں کے گرجے چھوٹنے لگے جو کسی خاص گروہ سے تعلق رکھتے ہیں یا نہ رکھتے ہیں۔  
 برہان شاہری میں ریشہ غلام تھے۔ اقبال سین فرائیڈ کی کچھ سی ملحدت غریبی ان میں جنرل گمال کی بنا پر انہل میں کرتا تھا۔  
 حاصل ہے۔ ان کی شاعری انواز فکر محبت لہر بر اعتبار سے اس اوصاف و اوضاع سے مرکب ہے جس کو غالب اور  
 نادرسی کے ان متغیر میں سے غصوب کیا جاتا رہا ہے جن کی بیرونی صورت غالب کے لیے باعث فخر تھی۔ دگر توجہ سے ان فرائیڈ  
 بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ابھی عشق بہم پہنچا چکے تھے اور شاعروں میں ان کی آواز غور سے سنی جانے لگی تھی۔  
 لیکن ان کی شہرت اور دلوں میں ملائے جنوں پر ان کا اثر ۱۹۲۰ء کے بعد سے شروع ہوا۔ وہ مشرق اور مغرب کے سادہ ترین  
 متکروں اور شاعروں کی رُوح اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہیں۔ دیانت کو راج اور دنا سورتھ کے نظام فکر سے  
 وہ خاص طور پر متاثر ہیں۔ اُردو کے سبھی شاعروں سے انہوں نے کچھ دیکر حاصل کیا ہے لیکن فکر و اسلوب دونوں میں  
 ان کی شاعری غالب کے گہرے اور متعلّق افق پر لیے ہوئے ہے۔ فرائیڈ آج تک اُردو کے نوجوان شاعروں خصوصیت  
 کے ساتھ غزل کے شاعروں کو متاثر کر رہے ہیں۔ جمیل نھری شاعر کی حیثیت سے ۱۹۳۳-۳۵ء میں ابھرے۔ ان  
 کی شاعری میں شستلی برک چاند رانی انیس کی ہے لیکن فکر اور بیان کی جانت کے ساتھ ندرت غالب کا فیض ہے۔  
 اور یہ چرنا تھا اس لیے کہ وہ وحشت فکری کے لاشہ کاغذ میں سے ہیں۔

نئے شاعروں کی دوسری پلومی علی سردار جعفری تھا، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، نعیم حسن بھٹی  
 کے نام سر فہرست آتے ہیں۔ یہ سب کے سب یا تو براہ راست اور واضح طور پر ترقی پسند تحریک کی نیابت کرتے ہیں  
 یا کسی دیکھی مدد کے تحریک سے متاثر ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایسا نہیں جو غالب کے چھوڑے ہوئے ترک کا حصہ اذہب  
 علی سردار کا مزاج رزمیہ ہے اور ادبی کا لہر و جزیرہ جو تاس ہے۔ انہوں نے متعدد نئے اور متاخرین اور اپنے  
 بزرگ معاصرین کا مذاکات کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور پھر بدیہ مغربی حکما اور شعرا سے بھی وہ متاثر ہیں۔ اس مطالعہ  
 سے ان کی شاعری کی تہ بنیت ہوئی ہے۔ تہ و اواز کی خیر نہیں اور نئے دنیا کو اسلام کے اکثر ٹھٹھے و عکاسی ہے جو کار  
 ہوتے ہوئے بھی شاعری کے اچھے نمونے ہیں۔ علی سردار کے برعکس مجاہد سراپا تغزل ہیں۔ ان کے اشعار میں ہنسری  
 کی آواز زانی تاثیر ہوتی ہے جو دل میں اکثر کھٹنے دانے کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے۔ وہ غانی اور جگر سے کافی  
 متاثر ہیں لیکن ذہنی کی طرح مرگ افق میں ہیں جبکہ کی طرح فکر و کامل سے فعال۔ ان کی شاعری فکر اور سخن کی خوش  
 آہنگ آئینہ کش ہے۔ ان سے اُردو غزل میں ایک ایسے میدان کی ابتدا ہوئی ہے جو تہم سے بے تعلق نہ چھوٹے ہوئے  
 اپنے اندر زنی کشش رکھتا ہے اور جس کو نرومانیت (NEO-ROMANTICISM) کہنا چاہیے۔ تہ و تغزل کا



علم و دلوں میں ایک ایسی نئی آواز دیں جو لطیف ہوتے ہوئے بھی گہرے ہیں۔ چنانچہ شاعر خضر بھی اسی خودمانی و بہت سی  
کے شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری میں دوسری چیزیں گونگی نہیں ہے جو ہمارا کوا تیزی و صفت ہے۔ جذبی بنیاد پر  
غزل کے شاعر ہیں۔ وہ انداز کے انتخاب اور اس کی ترکیب میں اہتمام اور احتیاط سے کام لیتے ہیں لیکن ان کی شاعری  
بہت سے انداز نامزدی اور حوصلے کے احساس کو تیز کر دیتی ہے۔ فیض احمد فیض کی شاعری میں وہ اختصار ترجیحی طریقہ کے  
ساتھ ملتا ہے جو ان کو فن بنانے کے لیے ضروری ہے اور جس پر خواہ مخواہ علی سردانہ ایک مرتبہ اعتراض کیا تھا۔ اسی  
انگڑا کا دوسرا اہم استعاریت یا رمزیت ہے جو غالب کی بھی ایک نمایاں اور منفرد صفت ہے۔ فیض کے اشعار فنی  
لغات کے ساتھ زندگی کے نئے توجہ کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ مدہم ہو میں ہمارے اندر موجودہ معاشرے سے نااموگ  
اور مسلسل انقلاب کی ناگزیری کا احساس پیدا کرتے ہیں مگر شعر کو تبلیغی لغو نہیں ہونے دیتے۔ انداز میں اپنے  
معاشرے میں وہ غالب سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ وہ خود بھی غالب کے انداز کی غامضی ترکیبیں تراشتے دیتے  
ہیں جس سے ان کے اشعار میں غیاپ یا فخر جتا ہے۔ فیض کی شاعری میں بحیرہ اقصیٰ یعنی بلندی یا گہرائی اتنی نہیں  
ہوتی جتنی ان سے توقع کی جاسکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان کے یہاں فکری قلم کم جتا ہے۔ ان کی شاعری  
اشعار کی شاعری ہے۔ احمد نواز خاں اپنے دور کے انشائیہ مضطرب مگر شعر بنانے کی کئی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی  
شاعری زندہ ہے اور مقابلہ کرنے کی تاب پیدا کرتی ہے۔ وہ اقبال کے توسط سے غالب سے متاثر ہیں۔ اسی زمانہ میں  
نثر و ادبی اور مجروح مضامین پڑھنے سے وہ غزل کو نئی نوا کہیں دیں اور اس میں ناز و نغمہ پیدا کیا۔ دوسری اپنے  
اپنے انفرادی اصول سے غالب کی آواز کے ارتعاشات اپنی شاعری میں جذب کیے ہوتے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے آخری برسوں سے اب تک اردو میں ایسے نئے شاعروں کی تعداد بہت ہے جنہوں نے  
ہماری شاعری کو نئے خیالات و رجحانات سے مالا مال کیا ہے اور اسلوب بیان میں ناز و کیفیتیں پیدا کی ہیں۔ ان کی گہری  
تقریباً بچاس سے بیس سال تک کی ہیں۔ یہ شعرا مختلف فکری و کتاب سے تعلق رکھتے ہیں اور جو صغیر کی دونوں ملکوں  
میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس دوران میں اردو غزل پر پانچ نظم آزاد نظم میں کامیاب کوششیں ہوئی ہیں جو یادگار  
تخلیق قربات کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ ان تمام فکری اور اسلوبی تغیرات و نزعات میں جب ہم کسی تاریخی سرچشمہ کی تلاش  
کرتے ہیں تو ہم کو غالب ہی پر ٹکنا پڑتا ہے۔ غالب کے ساتھ اب تک ہم ایک قوی تاریخی یکسانیت پاتے ہیں۔

غالب کس طرح اور کس حد تک ہمارے نگہ اور انداز میں ایک زندہ اور فعال قوت بنے ہوئے ہیں۔ اس  
کے علامات و دلائل کا کافی جائزہ لیا جاسکتا ہے لیکن بعض مسائل کی باتیں رہ گئی ہیں۔ یہ کچھ حیرت کی بات نہیں کہ



غالب کی خارج آہنگی اور مشکل پسندی کے باوجود سر سے داغ اور تیرہ ترک کے مشابہہ کے اشعار کی طرح یا شاید ان سے زیادہ ہی غالب کے اشعار ذوق سخن رکھنے والوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ مغرب انش اشعار میں غالب کے اشعار کی تعداد کم نہیں ہے۔ اگر مثالیں اکٹھا کی جائیں تو ایک بیابان تیار ہو جائے۔ ان میں سہل المتبع مشکل در میان بہر قسم کے اشعار ہیں گے۔ اس کے علاوہ تربیت یافتہ لوگوں کی صحبتوں علمی اور ادبی تقریروں اور تقریریں میں کتنے فقرے استعمال ہوتے رہتے ہیں جو غالب سے لیے گئے ہیں۔

اس سلسلہ کی ایک اور بات قابل غور ہے جس کی طرف دھیان کم ہوتا ہے۔ گزشتہ پچاس سال کی مدت میں اردو کے کتنے شاعروں اور مترجموں نے اپنی کسی ایک تخلیق یا کئی تخلیقات کے مجموعوں کے عنوان رکھے ہیں جو غالب کے اشعار ہی سے لیے گئے ہیں۔ سب سے پہلے جو مثال یاد آتی ہے وہ اردو کا ایک ڈرامہ ہے جس کا ہیرو جانی میں عبداللہ مجددیابی نے تخلص کے فرضی نام سے لکھا تھا۔ اس کا عنوان ”دو پیشانی“ ہے۔ پھر عبداللہ مجددیابی ہی نے اس کی تبلیغ کرنے والے ایک انگریز کی تصنیف کا ترجمہ کیا اور اس کا نام پیغام امن رکھا۔ عبداللہ مجددیابی کے مطلوب نگارش میں جو کشش ہے اس کا راز بھی یہی ہے کہ اس پر غالب کا اثر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں محمد حسین آزاد اور نذیر احمد کا رنگ بھی قریب کے ساتھ دکھایا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے ایک مضمون کا عنوان ”ہمایون“ ہے جو بالقصد غالب کے ایک شعر سے ماخوذ ہے۔ ان کے خاکوں کے ایک مجموعہ کا نام ”گھمسانے گھراس مایہ“ اور دوسرا گاہ علی گڑھ سے متعلق ایک طویل مضمون کا نام ”آشتی مانی میری“ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ رشید احمد صدیقی کے مضمون پر غالب کتنا چمکے ہوئے ہیں۔ ان کی عبارت میں بھی غالب کی بڑی کاری جوتی ہے لیکن اس پکاری میں سادگی اور یہی خستگی کی جگہ تکلف اور ابہام ہوتا ہے۔

داتم الحروف نے ۱۹۳۰ء میں اپنے اضافوں کے مجموعہ ”خواب و خیال“ کے لیے جب مقدمہ لکھا تو اس کا عنوان ”کچھ ارسلان شہزادہ اور جب اپنا ایک طویل افسانہ کئی صورت میں شائع کرایا تو اس کا نام ”تیسرے زون“ رکھا۔ شاہد احمد پوری کے خاکوں کے ایک مجموعہ کا نام ”غنیہ گوہر“ ہے۔ فیض احمد فیض کے کلام کے دو مجموعے ”نقش فریادی“ اور ”دوست و حشمت“ کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ گل ہونویدی کسی زمانہ میں ترقی پسندوں میں شامل تھے بعد کو سرکاری عہدہ قبول کر لیا۔ ان کا مجموعہ ”گ سنگ“ ہے۔ ڈاکٹر فرید الاسلام کی نظموں کا نام ”رگ جان“ ہے۔ بزرگ خاں نے اپنی کتاب کا نام ”ایک ہونوہو کی رکھا ہے۔ حزیں حامد علی کے منظومات کا مجموعہ ”دوست اسکان“ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ عبدالعزیز غلڈ نے اپنے ایک مجموعہ کا نام ”داتم کی شہر آرزو“ پسند کیا ہے۔ اختر جمال





کھنڈل کا آٹا انگلیاں شکا پڑتی ہے حافظ پر زور دیا جائے یا تلاش و تحقیق سے کام لیا جائے تو اجماع نہ جائے سخن  
شائیں مزید سامنے آئیں گی اور فرست خاص طویل ہو جائے گی۔

غالب فطرت کی طرف سے نت نیا ذہن لائے تھے یا اگر نیا ذہن پوری کی اصطلاح استعمال کی جائے تو  
انہوں نے اب سے کوئی پچاس سال پہلے انگلینڈ کی گیتاں میں کاتر جبر کرتے ہوئے تراشی تھی تو کیا جاسکتا ہے کہ فطرت کے  
غالب کو دائم الہدیت (ETERNALLY NEW) ذہن عطا کیا تھا۔ وہ اپنے زمانہ کے لیے نیا ذہن تھے۔ آج  
جی ہم ان کو ایک نیا ذہن پاتے ہیں اور ہر اس آنے والے دور کے لیے وہ نیا ذہن درمیں گئے جس کا تصور کیا  
جاسکے۔ اس لیے ہر نئے دور کا جدید سے جدید ذہن اپنے کو غالب سے قریب اور ناقوس پانا رہا ہے اور غالب کا  
انداز فکر اور شیوہ گفتار اس کی تفسیق قوت کو متحرک کرتا رہتا ہے۔ غالب ایک ایسا سرچرہ الہام ہیں جو کبھی تم ہو  
سکے گا نہ اپنی طراوت اور تازگی کھو سکتا ہے۔ ان کی نوائے شفتہ تولدے سروش ہے جو ہر زمانے میں سن جائے گی  
اور جو ہر نسل کے توانا اور صانع نوجوانوں کو زندگی اور توانائی کا نیا پیغام دینا سکھائے گی۔



## حق تو یہ ہے

از نفس اپنے دواستقیم صرف ترا نہ کردہ ایم

میرے ہم عمر احباب اور میرے جوان سال تلامذہ اور معتقدین مجھ سے بار بار پوچھتے رہے ہیں کہ میں نے اپنا ملک غالب پر کچھ کیوں نہیں کیا؟ جب کہ فارسی اور اردو کے کئی شخص گزشتہ پچیس برس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا ہوں اور جب کہ مزاج اور تربیت دونوں کی بنا پر میرے ذہن کو غالب سے زیادہ مناسبت ہے۔ یہ سوال اس وقت ہے اور مجھ کو ہرایا جانے لگا جب انگریزی میں عمر خیام اور شبلی پر اور اردو میں جبریل میرے مضامین شائع ہوئے۔ خود میں اس ذہنی غش میں مبتلا رہا ہوں کہ اب کس سی شاعر پر اپنے عقیدے کے مطابق کچھ نہ لکھوں گا جس کو اپنے ذہن و مانع سے قلم قریب پاتا، باہوں اور چٹھنا اپنی ذات سے ایک ادارہ ہے۔ لیکن ملک غالب پر جو کچھ سر لکھا ہوا یا لکھا ہوا سامنے آسکا ہے وہ تو وہ دوسرے گا ہی تقریریں میں جو مجھے اپنے طلباء کے لیے کالج یا یونیورسٹی کے کمرے میں کرنا پڑیں یا پریس کے خطوط میں ایک خط ہے جس میں غالب پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ یا ریڈیو سے نشر کی ہوئی دو تقریریں ہیں۔ ان کے علاوہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء کے اوائل تک کراچی کے مختلف اداروں نے غالب پر مجھ سے کئی ذاتی تقریریں کرائیں جن میں سے بیشتر غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلہ میں تھیں۔ ان تقریروں کی تعداد بارہ سے کم نہیں ہے۔ یہ سب ایک ناقابل فراموش اتفاق ہے کہ کراچی میں آنے کے بعد غالب پر عام جلسہ میں میری جو پہلی تقریر ہوئی وہ مشہور دہائی کی تحریک پر ان کے ادارہ ارباب قلم کی جانب سے ہوئی۔ جس ذہنی غش کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایک مزمن کیفیت ہے۔ اس کی ایک تاریخ ہے۔ اس کو تفصیل کے ساتھ نہیں پیش کر سکتا اس لیے کہ اس میں ایک ایسے شخص کا نام آتا ہے جو عمر میں مجھ سے خاصا بڑا تھا مگر ۱۹۶۲ء سے میرے ایک تکلف ادبی دوست خداداد میرا مزاج ہے۔ یہ کہہ



جس کو جانا ہو بھلا اس کو بڑا کیا کہتے

گو کہ یہ وضع ہے پر اب تو میں ہے اپنا

اور میرے دوست عمر میرا اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مرنے والے کا نام میں بھی برائی کے ساتھ نہیں لیا جاتا لیکن گزارشِ حوالہ واقعی ضروری ہے اس لیے مختصر اور سبب طور پر مٹی لیجئے۔ ۱۹۲۶ء کی گزیر میں کے دن تھے نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانک کر اندکس کس گھاٹ کا پانی پی کر کچھ دلی دم لینے کے لیے گورکھ پور میں رک گیا تھا۔ دورانِ سفر میں غالب کا نسخہ حمید یہ مرتبہ ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری کا ایک نسخہ پہلے بار پڑھا آگیا تھا جو میرے لیے دلچسپ باد آورده ثابت ہوا تھا۔ بجنوری کا احمد آفریں مضمون پڑھ کر میں مجھ میں اٹھا تھا۔ جوانی کی ابتدائی دہائیوں اور لڑکھانہ کار سے مرثیہ ردت تھا۔ ریشہ ریشہ میں ایک بڑی کیفیت اضطراب محسوس کرتا تھا جس میں صرف ایک سودا تھا اور وہ آزادانی کا سودا تھا۔ دل میں صرف ایک لگن تھی اور وہ اردو ادب کو خوب سے خوب تر دیکھنے کی لگن تھی۔ عربی اور فارسی کا علم عام حاضر تھا۔ انگریزی اور انگریزی کے ذریعہ دوسری زبانوں کے قدیم اور جدید معجزات اور فنکاروں کا مطالعہ معتبر اور تازہ تھا خیال یہ ہوا کہ مجھے بھی غالب پر اسی دھن کے ساتھ ایک مضمون لکھ کر ڈالنا چاہئے۔ اس زمانہ میں اور آج بھی جب جب میں نے بتیوں اور غالب کا مطالعہ کیا ہے مجھے لا محدود ماضی کے غیر قابلِ مستقبل کا احساس ہوا ہے۔ میں تو خیال آتے ہی میں نے مضمون لکھنا شروع کر دیا اور میں دین میں ختم کر دیا۔ مضمون کلمہ ہمیشہ اتنا ہی مضخم تھا جتنا بجنوری کا تھا اور اس سے کچھ زیادہ ہی ماضی کا تھا۔ متقدمین اور متاخرین سے موازنہ اور مقابلہ کا میں ایک طوفان تھا جو کچھ اپنے ساتھ لپیٹ لایا تھا۔ مضمون مکمل ہوا تو میرے ساتھیوں نے اس کو بہت پسند کیا۔ سوال یہ ہوا کہ اس کو شائع کہاں کرایا جائے۔ میں خود اس معاملہ میں روزِ اول سے بے نیلہ تھا۔ بس شعر کہہ ڈالنا یا کون مضمون لکھ ڈالنا میرا کام تھا وہ چھپے یا نہ چھپے یا کون اس کو کہاں شائع کرنے کے لیے لے جائے۔ اس کی بجائے کوئی پروا نہیں تھی۔ میرے اشعار تین سال سے اردو کے مقتدر رسائل میں شائع ہو رہے تھے۔ میں چار نہایت شہسوں علمی مضامین بھی نکل چکے تھے۔ اربابِ فوق و فکر مجھ سے بے غلجی واقف ہو چکے تھے۔ میرے ایک دوست تھے نعمت اللہ انصاری جو میرے ہم عمر اور ہم جماعت تھے۔ خاندانِ کار و بار کرتا تھا اور مشغول تھا۔ نعمت گھر کے لائے تھے لیکن علم و ادب سے شغف رکھتے تھے۔ اردو کے جتنے مشہور رسائل اور اخبار تھے سب کے خریدار تھے۔ انھوں نے لاہور کے ایک مقتدر ماہوار رسالہ کا نام لیا اور قند کرنے لگے کہ میرا مضمون اسی رسالہ میں شائع ہو۔ میں نے ان کے سامنے ہی مضمون رجسٹری رسالہ مذکور کو بھیج دیا۔ دو سالہ کے



ادارتی مجلس میرے وہ دوست بھی تھے جن کا ذکر کر چکا ہوں۔ انھوں نے مضمون کی رسید میں مجھے لکھا کہ مضمون مستثنیٰ عن التقریفات ہے اور آئندہ شمارے میں شائع ہوگا۔ آئندہ شمارہ نکلا۔ آئندہ کے بعد کی آئندہ شمارے نکلے مگر مضمون شائع نہ ہوا تھا غصے کا ایک خط لکھا جواب آیا کہ چند مہینوں کی وجہ سے اب تک مضمون نہ چھپ سکا لیکن آئندہ اشاعت میں ضرور چھپے گا لیکن کسی آئندہ اشاعت میں مضمون نہ چھپے مجھے ان دنوں اتفاقاً کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ مرحوم ایک سالے سے دوسرے رسالہ کی مجلس ادارت میں مشغول ہوتے رہے۔ کچھ دنوں کے بعد کیا دیکھا ہوں کہ میرے مضمون کے مختلف پارے تھوڑے بہت چھوڑ دو بدل کے ساتھ مختلف فوجاں لکھنے والوں کے نام سے مختلف رسالوں میں شائع ہو رہے ہیں۔ اب کس کو کیا کہنا۔ مضمون کی دوسری نقل بھی میرے پاس نہیں تھی کہ کسی دوسرے رسالہ کو بھیج دیتا۔ اسی کے بعد سے میری کوشش رہی کہ جو مضمون کھوں اس کی نقل اپنے پاس رکھوں۔ یہ ہاشم خاں پر میرے پتلے مضمون کا جس میں میں نے جی کھولی کہ اپنی ہماری ذوات اور ملی قابلیت صرف کر رہی تھی۔ پھر تھیں ہی بار خاں پر لکھا چاہا لیکن ہر بار ایسا محسوس کرتا کہ دہر تو ہے لیکن لکھا تھا سائنس جو یہ ہے کہ اُن دور کے بہت سے شاعروں اور نویسوں پر غلامی کے عین چار شاعروں پر اور غریب کے بعض حکما اور شعرا پر تو لکھا رہا لیکن غالب کو باتوں میں شمار نہ رہا۔

۱۹۷۰ء کی ابتدا میں شب بنم روانی نے اپنے ادا سے اگر باب قلم کی طرف سے تجویز کی کہ میں غالب پر سلسلہ چار تقریریں کروں جن میں ان کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر وضاحت کے ساتھ بحث ہو۔ شب بنم گفتی کے ان چند لوگوں میں میں جن کی خاطر ہر حال میں مجھے منظور رہتی ہے اور جن کا کہنا کرتے نہیں بتا میں نے مایہ جہل لیکن ساتھ ہی ساتھ خود اپنے لیے ایک مشکل پیدا کر لی۔ صرف شب بنم کی تجویز پر عمل کرتا تو کوئی دشواری نہیں تھی۔ چار تا دہائیوں میں بات ختم ہو جاتی۔ مگر میں نے سوچا اور شب بنم نے دو گنی خوش سے میرے اس خیال کی تائید کا جب اس اہتمام اور مسلسل کے ساتھ غالب پر تقریریں کرنا ہی نہیں تو کیوں نہ ان تقریروں کو پہلے لکھ لاؤں۔ چنانچہ میں نے لکھنا شروع کیا۔ گزشتہ چھ سال سے خواب صحت اور فلاحی زندگی کی الجھنوں میں جیسے جبکہ زندگی گزار رہا ہوں ان کے ہوتے ہوتے غالب پر مرکز اور مربوط و مسلسل توجہ کے ساتھ لکھنا میرے لیے ایک بہتر خواہ سے کم تھا۔ پھر میں نے یہ جہم کیسے اور کب مر گیا ہیلر اول تو جاننا ہی نہیں شب بنم کو بھی کبھی اس آزمائش سے سابقہ نہ پڑا ہوگا۔ ان کے صبر و تحمل اور استقلال کی داد کچھ میں ہی دے سکتا ہوں۔ وہ بارہا تہائی نئی اور شرافت کے ساتھ زرب مجھے یاد دلاتے رہے اور میں ان ہاں مکتار رہا۔ آخر کار ۱۹۷۱ء کے وسط میں تقریریں شروع



ہوئیں اور تجربہ کی شہرت ہوئی۔ تقریریں لکھی جوتی تھیں۔ یہی تقریریں تو میں نے جلسہ میں پڑھی تھیں، باقی تین تقریریں رسانی رہیں۔ یہ چاروں تقریریں پر میں کلب کراچی میں کلب کے محلہ کے تعاون سے ہوئیں۔ ششہفتہ خانہ تقریریں کو کتاب کی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ حالات کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے اب تک ان تقریروں پر تقریریں کی اشاعت نہ ہوئی رہی۔ اس دوران میں بعض دستانوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کو یہ تقریریں چھاپنے کی اجازت دے دوں۔ وہ ایک دانشوروں نے بھی کہا کہ وہ ان تقریروں کو کتاب کی صورت میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ میں سب سے کہہ دیتا تھا کہ ششہفتہ روانی سے بات کریں اور ششہفتہ خاموشی کے ساتھ اپنے ارادہ پر قائم رہے۔ اب اس کی نوبت آئی ہے کہ خاموشی پر یہ تقریریں چھپ کر سامنے آئیں۔ اس پر وہ کہیں ہیں؟ یہ پتہ چھنے والے جانیں۔

ایک اہم بات میں کسی تقریر میں شامل نہیں کر سکا۔ جب دوسری تقریر میں غالب کے فوق و شکر پر اظہار خیال کر رہا تھا تو حاضرین میں سے میرے ایک دوست نے کہا کہ غالب نے فارسی میں جو اتنی کچھ کا ڈالا اگر وہی اردو میں لکھتے تو اردو کی کتنی بڑی خدمت ہوتی اور غالب کی کتنی قدر بڑھ جاتی۔ جلسہ کے صدر نے بھی اپنے صدارتی خطاب میں یہی بات دہرائی۔ یہ نگاہات محنتوں معلوم ہوتی ہے۔ لیکن فراموش ہے؟  
حمید برصغیر فاؤنڈیشن لاہور، جنرل ایڈمنسٹریٹر مہدی فیض محمد صاحب نے چپ کر سامنے آچکے ہیں۔ اہل تحقیق اور خاصانِ حدسہ کے لیے ان میں جس قدر مجھے تنقید و شخص کا سامنا ہو رہا ہے ان کے ذہن کے لیے ان کا بیشتر حصہ چستان سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتا اور خواص میں اپنی تمام ٹونگا فیروں اور بارکی بنیوں کے باوجود ان میں کچھ الجھے ہی جاتے ہیں شعاری میں یہ حصہ جس قدر بھی نئی یافت کا حکم رکھتا ہو اردو زبان کی اس نے بہت کم خدمت انجام دی ہے۔ غالب نے جو کچھ فارسی میں کہا ہے اگر وہ بھی اردو ہی میں کہا ہوتا تو کم سے کم تین دیوان اور ساتھی مسماست کے جوتے اور نقیبین ملنے ان کا نصف جزو ثنائی خلق اور ولیدہ ہونا مقبلا موجودہ فخر حمیدیہ کا ایک خاصا حصہ ہے۔ وہ گیا غالب کی قدر بڑھ جانے کا سوال سو یہ بھی محض ایک خیال ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے غالب کی قدر فطری فیادوی اور اندرونی ہے جس میں حذرت یا اسلاف کا امکان نہیں۔ یہ قدر اپنی جگہ واجب اور قائم ہے۔

فالبؔ پر بہت کچھ کہا اور کھٹا بچا کھلے۔ اور ابھی ہست کچھ اور کہا اور کھٹا جانے گا اس لیے کہ فالبؔ کے اشعار جب بھی از سر نو پڑھ جائیں گے تو ان کا ہر شعر ایک نئے انکشاف کی مسرت بخشنے لگا۔



موجودہ حالات میں مجھ سے بھی جس قدر ہوسکا غالب پر اپنے خیالات کو مجتمع اور سرِ لوحہ کر کے اربابِ فوق و نظر کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس سے دوسروں کی تشنگی کیا آسودہ ہوگی جب کہ خود میرے اندر تشنگی کا تیز احساس باقی ہے۔ غالب کا بھرپور حق تھا اور غالب کے ساتھ میری اداوت کا تقاضا تھا کہ ان پر کچھ کھوں اس وقت جب کہ کہہ سکتا تھا لیکن دل میں یہ چور موجود ہے کہ نہ میری اداوت کا تقاضا پورا ہوا اور نہ غالب کا حق ادا ہوا۔ بہر کیف ۔

بیاں گفتہ غالب نوشتہ ام مجنون  
خط متودہ ام و چشم آسندیں دارم

# مطبوعات ایجوکیشنل بکٹ ہاؤس علی گڑھ

## اقبالیات

۷۵/-	سچید اقبال اردو	عبدی ایڈیشن
۱۲۵/-	داؤد اقبال	آل احمد سروس
۷۵/-	اقبال شخصیت شاہر	رشیج انڈین پابلی
۸۰/-	اقبال تاور و مکار	پروفیسر نور الحسن نقوی
۳۰/-	اقبال فی ہر لحاظ	پروفیسر نور الحسن نقوی
۵/-	شکرہ جاب شکرہ مع شرح	علامہ اقبال
۳۰/-	بانگ درا (کسی)	علامہ اقبال
۲۰/-	ہاں میریل (کسی)	علامہ اقبال
۴۰/-	غریب نجیم (کسی)	علامہ اقبال
۱۰/-	اودھانی بھارادو (کسی)	علامہ اقبال

## غالبیات

۲۵/-	دیوان غالب	مفتقد فی الحسن نقوی
۳۸/-	غالب شاہر اردو خوب نگار	
۳۰/-	غالب شمس شاہر	جنرل گوگرم پوری

## سرسید

۲۰۰/-	سرسید احمد خاں اردو کا مہم	تریا سہین
۱۵/-	سرسید احمد خاں کے کلمات	نور الحسن نقوی
۳۰/-	مطالعہ سرسید احمد خاں	عبدالغنی
۴۰/-	سرسید اور اس کے نامور نقاد	سید عبدالرشید
۱۵/-	آجکل مضامین سرسید	آل احمد سروس
۵/-	سرسید ایک تعارف	پروفیسر عتیق احمد نقوی
۲۰/-	سرسید کی معرزی تقریریں	احمد عباس

## فیض

۵۰/-	کلی فیض علی	فیض احمد فیض
۱۰/-	نقش فراہی علی	فیض احمد فیض
۱۰/-	دست مہا علی	فیض احمد فیض
۱۰/-	زندان نامہ علی	فیض احمد فیض
۱۰/-	دست و سنگ علی	فیض احمد فیض

## لسانیات

۵۰/-	تقدیم تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر سہو سہین دلی
۱۰۰/-	اردو زبان کی تاریخ	ڈاکٹر موانیل احمد بک
۲۰/-	اردو کی لسانی تشکیل	ڈاکٹر عبدالعزیز احمد بک

اردو لسانیات ڈاکٹر نوگت سہنوالی ۳۰/-

## ادب و تنقید

۱۸۰/-	رشید احمد صدیقی کے خطبات	آل احمد سروس
۱۵۰/-	فکر و روشنی	آل احمد سروس
۱۵۰/-	بکھنچے کے مقالے	آل احمد سروس
۲۰۰/-	غواب بانی ہیں	آل احمد سروس
۳۰/-	اردو تحریک	آل احمد سروس
۳۸/-	افکار کے دیئے	آل احمد سروس
۱۰۰/-	جینکس مرگ	رضا علی عابدی
۱۵۰/-	سحر و جادو	رضا علی عابدی
۸۰/-	کتاب خانہ	رضا علی عابدی
۱۲۰/-	نصیری اہالیوں کی	نور الحسن نقوی

۷۵/-	اردو کی ترقی پسند تحریک	خلیل الرحمن خلی
۳۰/-	فیض احمد خاں کی تحقیر	پروفیسر نور الحسن نقوی
۵۰/-	اردو شاہی کا تنقیدی مطالعہ	سنبھل سنگھ
۶۰/-	اردو نشر کا تنقیدی مطالعہ	سنبھل سنگھ
۱۵۰/-	ترقی پسند تحریک اور اردو شاہی	محبوب احمد
۱۵۰/-	پروفیسر گلشن کی تحقیر	نور الحسن نقوی
۵۰/-	اردو کا ادب کا اسلوب	عبدالغنی
۷۵/-	فروع تنقید	عبدالغنی
۳۰/-	دانش کی ناول اور افسانہ	مہمان قاسمی
۱۰۰/-	جدید لسانیات	اردو ہندی طارق پشٹاوی
۱۰۰/-	اردو میں غور و خیر	اردو نگار کی تحقیر
۱۵۰/-	آل احمد سروس شخصیت	اردو انجمن
۳۰/-	اردو ادب کی تاریخ	ظہیر الحق جنیدی
۵۰/-	سامی ادب اردو	نور الحسن نقوی
۵۰/-	اردو ناول کی تاریخ	تحقیر علی عباس سہین
۵۰/-	اردو ناول کی تاریخ	تحقیر عشرت رحمانی
۱۸۰/-	دکن ادب کی تاریخ	فیض احمد فیض
۳۰/-	اردو قصیدہ نگاری	مترجم بانی شریف
۲۵/-	اردو نثر نگاری	مترجم بانی شریف
۲۰/-	ناول کا فن	مترجم بانی شریف
۲۰/-	اردو نثری کا ارتقاء	عبدالغنی سہنوالی

مہر نے ہندو کا تعلق پیش کش کیا تھا (مہر نے ہندو کا تعلق  
مہاروی سیاست (ایڈیٹر آف انڈینس) ۳۰۰۰

### مفتقر

تعلیم اور اس کے حصول پر مفتقریت خاں ۳۰/۰۰  
جدید تعلیمی مسائل ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۵/۰۰  
اصول تعلیم ۳۵/۰۰  
تعلیم داریس کے بنیادی اصول پر مفتقریت خاں علی ۳۵/۰۰  
تعلیمی تعلیمات کے نئے زاویے مفتقریت خاں ۳۵/۰۰  
نام حشرات ڈاکٹر ضیاء القرآن علی ۱۵/۰۰  
ایکادامات کی کہانی ۱۵/۰۰  
علم و سیاست حشرات و نظریات ۳۰/۰۰  
جدید علم و سیاست ڈاکٹر حسین ۳۰/۰۰  
ریبر تحریکی مفتقریت خاں ۳۵/۰۰  
ریبرست ۳۰/۰۰  
علم و تادی ۳۵/۰۰  
بکلی کی تربیت ۳۵/۰۰  
تعلیم و سیاست ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰  
تعلیم و سیاست ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۱۵/۰۰  
اردو و علم ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۱۲/۰۰  
اردو و ۹/۰۰  
اردو و تعلیم (ہندی کے ذریعہ اور کچھ) ۱۵/۰۰  
انڈین نیشنلسٹ کی تعلیم و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰

### خانی و افغانی

حضرت بہان (ناول) خانی عبد الستار ۶۰/۰۰  
شب کویدہ (ناول) ۲۰/۰۰  
پندرہ ناول (ناول) قرقا حسین محمد ۷۵/۰۰  
آزاد کے سفر ۱۰۰/۰۰  
دکھن کی تادی و افغانی ۷۵/۰۰  
ہندی (ناول) حضرت چغتائی ۲۰/۰۰  
انگلی (ناول) ندیم رحیم ۵۰/۰۰  
ایڈیٹر نے ایک ناول افغانی تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰  
کوشن چند اداان کے افغانی ۳۰/۰۰  
ہلکتہ پندہ و افغانی ۳۰/۰۰  
اردو کے تادی و افغانی ۳۰/۰۰  
غلو کے ناول و افغانی ۳۵/۰۰

اردو و تادی کا ارتقاء عبارت بر علی ۵۰/۰۰  
غلی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰  
نیا افغانی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰  
دستگیری و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۵۰/۰۰  
اردو کی تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۲۰/۰۰  
اردو کے تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰  
آرٹ و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۱۵/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۱۵/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۶۰/۰۰  
اردو و تادی کا ارتقاء عبارت بر علی ۳۰/۰۰  
آرٹ و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۵۰/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۱۵/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۸۰/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۲۲/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۱۶/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۲۵/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۱۲/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۱۲۵/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۵۰/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۲۵/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۱۵/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۱۵/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۱۵/۰۰

### سیاسیات

دنیا کی تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۵۰/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰  
تادی و تادی ڈاکٹر فیضان القرآن علی ۳۰/۰۰



